

اپنی تلاش

قاسم علی شاہ

اپنی تلاش

خودشناسی کے موضوع پر

قاسم علی شاہ

کے متفرق لیکچرز سے انتخاب

قاسم علی شاہ - ایک تعارف



قاسم علی شاہ بنیادی طور پر ایک استاد ہیں۔آپ 1998ء سے شعبہ تدریس سے وابستہ ہیں۔آپ نے 2001ء میں قاسم علی شاہ اکیڈمی قائم نے نام سے اپنا پہلا تعلیمی ادارہ قائم کیا جو لاہور جیسے تعلیم افروغ شہر میں ایک نمایاں مقام رکھتا ہے۔قاسم علی شاہ اکیڈمی کی خاص شہرت یہاں تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ وطالبات کی تعلیم کے ساتھ ان کی اخلاقی تربیت اور تعمیر شخصیت پر بہ طورِ خاص توجہ ہے۔آپ ویزیٹنگ پروفیسر کے طور پر تدریسی شعبے میں اپنی خدمات سرانجام دے چکے ہیں۔

شاہ صاحب کا اگلا پڑاؤ ٹریننگ اور تربیت ہے، کیونکہ ان کا فلسفہ ہے کہ تعلیم کا اصل مقصد تربیت ہے اور تربیت کے بغیر تعلیم اپنا اثر قائم نہیں رکھ سکتی۔چنانچہ کئی برس سے وہ اپنے آپ کو نئی نسل کی ٹریننگ اور موٹیویشن کیلئے وقف کر چکے ہیں۔اس ضمن میں آپ ملازمین کی موٹیویشن، کسٹمر سروس مینجمنٹ و کسٹمرز سے تعلقات، ذہنی دباؤ اور غصے پر قابو، ٹائم مینجمنٹ، لیڈر شپ، اخلاقی اقدار، اہداف کو حاصل کرنے کی مہارت، تنظیم سازی، منتظمین کی صلاحیتوں کا نکھار، کارکردگی میں اضافہ، فنی مہارتیں، شخصیت کی تعمیر، کردار سازی، آپسی تنازعات کا حل جیسے انتہائی اہم موضوعات پر لیکچرز، ورکشاپس، سیمینارز اور سمپوزیم کا باقاعدہ انعقاد کرتے ہیں۔

ملک کے نمایاں تعلیمی ادارے (اسکول، کالج اور یونیورسٹی) جو قاسم علی شاہ صاحب سے استفادہ کر چکے ہیں، ان کے نام یہ ہیں: گورنمنٹ کالج یونیورسٹی لاہور، سپیریر یونیورسٹی لاہور، پنجاب یونیورسٹی لاہور، یونیورسٹی آف سرگودھا، یونیورسٹی آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی لاہور، لاہور اسکول آف مینجمنٹ، کامسیٹ انسٹیٹیوٹ آف انفارمیشن ٹیکنالوجی لاہور، فارمن کرسچن کالج لاہور، نیشنل ٹیکسٹائل یونیورسٹی فیصل آباد، یونیورسٹی آف مینجمنٹ اینڈ ٹیکنالوجی لاہور، یونیورسٹی آف سنٹرل پنجاب لاہور، پروجیکٹ مینجمنٹ انسٹیٹیوٹ لاہور، اسلامیہ کالج سول لائنز لاہور، یونیورسٹی آف ایگریکلچرل فیصل آباد، یونیورسٹی آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی خضدار بلوچستان، رچنا کالج آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی گوجرانوالہ، نیٹو اسکول سسٹم لاہور، فاؤنڈیشن یونیورسٹی راولپنڈی، لاہور کالج فار وومن یونیورسٹی لاہور، الہدیٰ اسکول لاہور، حسن اسکالرز نارووال، ڈی ایم جی اسکول آف لیڈر شپ کراچی، پیپی ہومز اسکول سسٹم فیصل آباد، یونیورسٹی آف گجرات، زمیندارہ کالج گجرات، سپیریر کالج مریدوالا، یونیورسٹی آف انجینئرنگ اینڈ ٹیکنالوجی ٹیکسلا۔یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔

سرکاری اور کارپوریٹ اداروں میں آپ کی ٹریننگ کو وقت کی اہم ترین ضرورت سمجھا جاتا ہے۔قاسم علی شاہ اب تک درج ذیل اداروں سے وابستہ اسٹاف کو ٹریننگ کرا چکے ہیں: اسکول آف انفنٹری اینڈ ٹیکٹکس کوئٹہ، ڈائریکٹوریٹ اسٹاف ڈویلپمنٹ لاہور، مینجمنٹ پروفیشنل ڈویلپمنٹ ڈیپارٹمنٹ لاہور، ڈی جی ٹی آر نیشنل ہائی وے اینڈ موٹر وے ٹریننگ کالج، پولیس ٹریننگ کالج چوہنگ، پنجاب جوڈیشل اکیڈمی لاہور، آرٹلری مرکز اٹک، سہالہ پولیس ٹریننگ کالج، ٹیوٹا لاہور، سی ایم ایچ پاکستان، لنڈ بیک، ایف ایم فوڈز، اٹلس ہنڈا کار، ملت ایکوپمنٹ لمیٹڈ، سیمنز (SIMENS)، سن کروپ، نیٹ سول، برائٹو پینٹس، گرین گرو، پاکستان کروپ پروٹیکشن ایسوسی ایشن، الادین گروپ، سرل فارما کمپنی، کونفر سلوشنز، ٹائیل سلیکٹ، ہیلٹن فارما، پیپسی کولا انٹرنیشنل، پپی لائنگ پینٹس، بحریہ انگلیو، ایڈی ڈاس، نووارٹس فارما، یو ایس اپیرل اینڈ ٹیکسٹائل، نیوکیم، دارالامان، دارالشفقت، اخوت فاؤنڈیشن، کریسنٹ لائن کلب، روٹری کلب، ریڈ فاؤنڈیشن بھیمبر آزاد کشمیر۔

اپنی مہارت اور تجربے کے باعث آپ عصر حاضر کے مقبول ترین ٹرینرز ہیں۔ملک کے مرکزی شہروں کے علاوہ دور دراز علاقوں سے پاکستانی جوق در جوق شاہ صاحب کے تربیتی پروگراموں میں بھرپور شرکت کرتے ہیں۔بیش بہا عوامی دلچسپی کے باعث شرکا کو بعض اوقات ایڈوانس بکنگ کیلئے طویل انتظار کرنا پڑتا ہے۔ اندرونِ ملک کے ساتھ ساتھ بیرون ملک بھی آپ کے پروگراموں کی طلب روز بہ روز بڑھ رہی ہے۔حال ہی میں لندن سے کامیاب ٹریننگ سیشنز کر کے لوٹے ہیں۔

ورکشاپس کے علاوہ ایف ایم ریڈیوز اور قومی سطح کے ٹی وی چینلز سے بھی اپنے لائیو پروگراموں کے ذریعے تشنگانِ علم کی پیاس بجھا رہے ہیں۔اس کے علاوہ سوشل میڈیا پر آپ اس وقت پاکستان کے سب سے زیادہ سرچ ہونے والے موٹیویشنل اسپیکر ہیں جہاں روزانہ کی بنیاد پر دنیا بھر سے لاکھوں لوگ آپ کے آڈیو، وڈیو لیکچرز اور ٹاک شوز سے مستفید ہو رہے ہیں۔اب تک آپ کو پی ٹی وی، سما ٹی وی، بول ٹی وی، جیو نیوز، سٹی 42، ایکسپریس نیوز، وقت نیو، 7 نیوز، مائی ٹی وی، پیغام ٹی وی، ہوپ ٹی وی اور FM 100، FM 98.6، FM 95، FM 101 پر بطور مہمان بلایا جا چکا ہے۔یہ سلسلہ جاری ہے۔

قاسم علی شاہ صاحب کی زیر سرپرستی 2017ء میں قاسم علی شاہ فاؤنڈیشن کا قیام عمل میں آیا۔اس فاؤنڈیشن کے ذریعے زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے کامیاب اور نامور پروفیشنلز ایک منفرد تعلیمی تکنیک کے تحت اپنے تجربات اور مہارتیں نوجوان نسل کو منتقل کر سکیں گے۔

''اونچی اڑان'' آپ کی پانچویں کتاب ہے۔اس سے قبل قاسم علی شاہ کے درجنوں مضامین اور تحریروں کے ساتھ ساتھ آپ کی پانچ کتابیں شائع ہو چکی ہیں:-

کامیابی کا پیغام، ذرا نم ہو۔۔۔، آپ کا بچہ کامیاب ہو سکتا ہے، بڑی منزل کا مسافر، اونچی اُڑان۔

دو تین کتابیں ''اپنی تلاش'' اور ''سوچ کا ہمالیہ'' زیر اشاعت ہیں۔

قاسم علی شاہ صاحب کے بارے میں مزید معلومات اور تازہ سرگرمیوں سے واقف رہنے کیلئے درج ذیل لنکس کو سبسکرائب کیجیے:

www.facebook.com/Qasim.Ali.Shah www.QasimAliShah.com Cell: 0321-6531424

اپنی تلاش

''میں کون ہوں؟''

دنیا کی تاریخ میں یہ سوال ہمیشہ سنجیدہ شخص کو ملا ہے۔ آج تک اللہ تعالیٰ نے یہ سوال غیر سنجیدہ شخص کو دیا ہی نہیں ہے۔ کیا میں نے صرف والدین کے کہہ دینے پر داخلہ لیا ہے؟ کیا صرف میرا میرٹ لسٹ میں نام آ گیا ہے، اس لیے داخل ہوا ہوں؟ آپ دیکھیں کہ آپ کو خدا نے کس کام کیلئے پیدا کیا ہے۔ حضرت واصف علی واصفؒ کے پاس ایک شخص آیا۔ اس نے سوال کیا کہ سر، کیسے پتا لگتا ہے اپنے آپ کا؟ انہوں نے جواب دیا کہ چند دن بعد یہ سوال کرنا۔ ہفتے بعد آپؒ نے اس سے پوچھا کہ تمہارا سوال کیا تھا؟ اس نے کہا، میں سوال بھول چکا ہوں۔ آپؒ نے فرمایا کہ جس سوال کو تم ایک ہفتے بھی اپنے پاس سنبھال کے نہیں رکھ سکے، قدرت تمہیں اس کا جواب نہیں دے گی۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کے اندر ایک خوبی، ایک صلاحیت بلا کی رکھی ہے۔ آپ نے کبھی اس کو دیکھا ہی نہیں۔ ممکن ہے، کوئی بہت اچھا استاد ہو، کوئی بہت اچھا محقق ہو، ممکن ہے کوئی بہت بڑا کاروباری آدمی ہو۔

اخلاقیات آپ میں آ جائیں گی، لیکن آپ یہ ضرور دیکھیں کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو کون سی خاص صلاحیت سے نوازا ہے۔ یہ کوئی بری بات نہیں ہے کہ آپ ڈگری لینے کے بعد اپنی لائن تبدیل کر لیں۔ لیکن جس کام کیلئے اللہ تعالیٰ نے آپ کو بھیجا ہے، کہیں وہ کام رہ نہ جائے۔ اگر آپ اس سارے نظام کو دیکھ کر اسی ڈگر پر چل رہے ہیں تو پھر آپ کو کامیابی نہیں ملے گی۔ جب آپ اپنے شوق کو ڈھونڈ لیتے ہیں تو آپ کو اپنا کام کام نہیں لگتا، کام اس کو کام لگتا ہے جو کام کو کام سمجھ رہا ہے۔ جس کیلئے کام فن ہے، عبادت ہے، شوق ہے، وہ کبھی نہیں تھکے گا۔ حضرت بابا بلھے شاہؒ جیسے صوفیا کرام نے فرمایا، ''اپنے اندر جھاتی مار'' کہ اپنے اندر دیکھو۔ جب آپ اپنے آپ کو تلاش کر لیتے ہیں تو سب پہلا تحفہ جو قدرت آپ کو دیتی ہے، وہ آپ کا اپنی ذات پر اعتماد ہوتا ہے۔ قدرت کی ہر چیز کو پتا ہے کہ میں کس لیے ہوں جیسے سورج روشنی دینے کیلئے ہے، پھول خوشبو دینے کیلئے ہے، دریا پانی کے بہاؤ کیلئے ہے۔ یہ آپ کی چھوٹی سی زندگی ہے۔ دوبارہ اس دنیا میں آپ کو نہیں آنا۔ آپ کو ایک بار موقع ملا ہے، لہٰذا آپ اپنے اندر یہ سنجیدہ سوال پیدا کیجیے۔ (کتاب ''بڑی منزل کا مسافر'' سے)

شان دار زندگی

ایک شخص اپنی بہترین صلاحیتوں کا اظہار کرتا ہے تو وہ شان دار ہے۔ ہر فرد کی اپنی صلاحیت مختلف ہوتی ہے۔ ہم ساری زندگی انتظار کرتے ہیں کہ اگلے وقت میں بہتر کریں گے، مگر وہ ''اگلا'' وقت نہیں آتا۔ اس کیلئے بہتر یہی ہے کہ ہم اپنی بہترین صلاحیتوں کا اظہار فوری کرنا شروع کر دیں۔ یہ اظہار ایک وقت کا، ایک زمانے کا، ایک صورتِ حال کا، ایک دن کا اور ایک لمحے کا ہو سکتا ہے۔ مثال کے طور پر، آج آپ کی بہترین صلاحیت کچھ اور ہے، دس سال پہلے کچھ اور تھی۔ اسی طرح، آنے والے وقت کیلئے بہترین صلاحیت کے اظہار کا معیار بدل جائے گا، کیونکہ آپ میں بہتری آ رہی ہے۔

حضرت مولانا جلال الدین رومیؒ فرماتے ہیں، میں نے دیکھا کہ بھیڑوں کے ایک گلے میں شیر کا بچہ رہنے لگا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کی ساری عادات بھیڑوں والی ہوگئیں۔ ایک دن اس نے شیروں کا جھنڈ دیکھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہاں سے ایک شیر نکلا اور اس نے ایک بھیڑ کو چیر پھاڑ دیا۔ اس عمل سے اس بچے کے اندر کا شیر جاگ گیا۔

مشہورِ زمانہ ٹرینر اور مصنف روبن شرما کچھ لوگوں کو ٹریننگ دے رہا تھا۔ اس نے تمام شرکا میں ایک ایک سیب تقسیم کیا اور کہا کہ اسے کھائیں۔ ان سب نے سیب کھانا شروع کر دیا۔ ان میں سے کسی نے جلدی سیب کھا لیا تو کسی نے زیادہ وقت لگایا۔ ایک ہنگامہ سا مچ گیا۔ آدھے گھنٹے میں یہ مشق ختم ہوگئی۔ اس کے بعد نئے سیب دیے گئے اور شرکا سے کہا گیا کہ اب یہ سیب اس طرح کھانا ہے کہ یہ آپ کی زندگی کا آخری سیب ہے۔ یہ سننے کے بعد شرکا نے اپنے سیبوں کو مزے لے لے کر کھانا شروع کر دیا۔ ہر فرد اپنے سیب کے ذائقہ سے محظوظ ہو رہا تھا۔ کسی کو جلدی نہیں تھی۔ جب انھیں پتا چلا کہ یہ سیب ان کی زندگی کا آخری سیب ہے تو وہ اس سے مزہ لینے لگے۔ اس مشق کے بعد روبن شرما کہتا ہے کہ یہ لمحہ جو آپ گزار رہے ہیں، یہ بھی آخری سیب ہی ہے۔ آپ جو دن گزار رہے ہیں، یہ بھی آخری سیب ہے۔ یہ وقت جو آپ گزار رہے ہیں، یہ بھی آخری سیب ہے، مگر ہمیں واہمہ ہوتا ہے کہ یہ آخری سیب نہیں ہے، یہ آخری لمحہ نہیں ہے۔ چنانچہ ہم اپنی زندگی سے لطف نہیں اٹھا پاتے۔

ہم دنیا کے کیلنڈر پر لاکھ جادو کرلیں، ممکن نہیں ہے کہ آج کا دن آپ کی زندگی میں دوبارہ آئے، اس لیے آج کے دن کو سلام کیجیے اور خوش دلی سے اس کا استقبال۔ آج کا دن اللہ تعالیٰ نے آپ کو انعام کے طور پر دیا ہے۔ اس کا بہترین استعمال کیجیے۔ کبھی بھی زندگی میں کوئی چیز ضائع کرنے لگیں تو آخری سیب کو ضرور یاد کر لیجیے۔ اس مثال سے یہ فائدہ ہوگا کہ آپ کی سوچ بدل جائے گی، آپ کے جذبات بدل جائیں گے۔

کسی کو بھی یقین نہیں کہ وہ آنے والے کل میں زندہ رہے گا یا نہیں۔ یقین صرف یہی ہے کہ اس وقت سانس چل رہی ہے۔ جب کل کا یقین ہی نہیں ہے تو پھر آج کا دن دنیا کا سب سے قیمتی دن ہے، کیونکہ یہ دن دوبارہ نہیں آنا۔ آج سے دس سال پہلے بھی آپ یہی سوچتے تھے کہ ابھی بہت وقت پڑا ہے، آج زندگی کی ساعتیں باقی رہ گئی ہیں تب بھی اس دھوکے میں ہیں کہ ابھی بہت وقت ہے۔ کتنی عجیب بات ہے کہ ہماری زندگی کے لمحات کم ہوتے رہتے ہیں اور ہم ہر سال زندگی کم ہونے کی خوشی مناتے ہیں۔ گزرے ہوئے دنوں کی خوشی منانے کی بجائے عقل مندی یہ ہے کہ اس گزرتے ہوئے وقت کو شان دار بنا لیا جائے۔ حضرت شیخ سعدی شیرازیؒ فرماتے ہیں، ''جو کہتا ہے، میرا کل آئے گا تو میں کروں گا، اس کا کل کبھی نہیں آتا۔''

آپ سو سال پیچھے چلے جائیے اور ایک لمحے کیلئے سوچیے کہ سو سال پہلے تو ہمارے والدین بھی نہیں تھے، ہمارے وجود کی بات تو دُور کی ہے۔ اسی طرح، آپ سو سال آگے چلے جائیں اور غور کیجیے کہ ہم اس دنیا میں نہیں ہوں گے۔ شاید ہمارا نام بھی نہ ہو۔ جب سو سال بعد ہمارا وجود یا نام نہیں ہوگا تو ہم محسوس کریں گے کہ ہم تو دنیا جی کر ہی نہیں آئے۔ مجھے تو صرف ایک ہی سیب ملا تھا اور میں اس واہمے کے ساتھ اس سیب کو تیزی کے ساتھ ہڑپ کر گیا کہ ابھی اور سیب بھی ملیں گے۔ زندگی تو ایک بار ملی ہے اور ہم نے ایک بار کی زندگی کو ایک دم سے ہڑپ کر کے ضائع کر دیا۔ ہم نے زندگی سے فائدہ اٹھایا اور نہ دوسروں کو فائدہ دیا۔ زندگی یوں ہی بے کیف اور بے سرور گزار ڈالی۔

زندگی کا سبق

ہر آدمی، ہر مرد و زن اس غلط فہمی میں مبتلا ہے کہ مجھے نہیں مرنا، دوسروں کو مر جانا ہے۔ یہ حادثہ، یہ واقعہ، یہ سانحہ جو کسی دوسرے کے ساتھ ہوا ہے، میرے ساتھ نہیں ہوگا۔ یہ ایک واہمہ ہے جو تقریباً ہر انسان میں پایا جاتا ہے۔ ایک ایسا دن بھی ضرور آنا ہے جس دن ہم نے چلے جانا ہے، جس دن ہم زمین سے چار پانچ فٹ نیچے ہوں گے، جس دن ہمارا دنیا میں وجود نہیں ہوگا، جس دن ہمارا دنیا میں کوئی تذکرہ نہیں ہوگا۔ کتنے ہی ماہر فن، کتنے ہی طرم خاں ایسے ہیں جنہیں آج کوئی نہیں جانتا، مگر وہ اپنے وقت کے بڑے نام تھے۔ ہم بھی اپنے بڑوں کو نہیں جانتے، ہمیں اپنی تاریخ کا بھی نہیں پتا۔ ہم کل کی باتیں تو جانتے ہیں، مگر سو سال پہلے جو قبرستانوں میں دفن ہو گئے، آج ان کے نام تک کا بھی نہیں معلوم۔ انسان اتنا چھوٹا ہے کہ پوری کائنات میں ایک زمین، اس زمین میں ایک ملک، ایک ملک میں ایک صوبہ، ایک صوبے میں ایک شہر اور ایک شہر میں ایک انسان۔۔۔ یہ ہے اس کی Value کہ اسے دفن ہونے کیلئے چھ فٹ زمین چاہیے۔ اس کے بعد مٹی، گرد وغبار۔۔۔ ہفتے، مہینے، سال، صدیاں گزر جاتی ہیں۔ ایک وقت ایسا آتا ہے کہ پھر اس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ کبھی ہوتے تھے۔ پھر ایک وقت وہ بھی آتا ہے کہ جب کسی کو پتا ہی نہیں ہوتا۔ کس قدر بے بسی ہے۔

کھربوں سال کا فاصلہ ہے۔ جب انسان پیدا نہیں ہوا تھا، پھر نا معلوم کتنے کھرب سال کا فاصلہ ہے۔ پھر وہ پیدا ہوتا ہے۔ اس کے بعد وہ مرے گا۔ پھر، نا معلوم کتنے ہزار سال کا فاصلہ ہے کہ جب اسے اٹھایا جائے گا۔ اس کے درمیان اس کی مختصر سی زندگی ہے۔ اس مختصر سی زندگی میں ایک بچپن ہوتا ہے جس میں ہمارے کھیل ہوتے ہیں، جس میں کاغذ کی کشتی ہوتی ہے، جس میں گڑیا کی شادی ہے، جس میں ہم چھوٹی چھوٹی باتوں پر ناراض ہوتے ہیں، جس میں چھوٹی چھوٹی چیزوں پر ہم خوش ہوتے ہیں۔ ہمارے لیے ایک کینڈی بھی بہت ہوتی ہے۔ آخر کار، ہم پڑھنے لگتے ہیں۔ پھر بڑے ہو جاتے ہیں اور ساتھ ہی ہماری زندگی میں شعور آ جاتا ہے۔ جیسے ہی شعور آتا ہے، شعوری زندگی بھی شروع ہو جاتی ہے۔ شعور سے پہلے زندگی نہیں ہوتی، وہ تو ایک لاعلمی ہوتی ہے، کیونکہ شعور نہیں ہوتا۔ شعور کے آنے کی پہلی پہچان یہ ہے کہ شعور آتے ہی انسان پوچھتا ہے کہ میں دنیا میں کیوں آیا ہوں۔ اس سوال کا تعلق نہ عمر کے ساتھ ہے، نہ بال سفید ہونے کے ساتھ ہے، نہ اسکول و کالج کے ساتھ ہے۔ یہ سوال کبھی بھی اٹھ سکتا ہے۔ دنیا کی کسی مخلوق میں یہ سوال نہیں اٹھتا۔ صرف انسان وہ واحد مخلوق ہے جس کے دل میں یہ سوال اٹھتا ہے۔ ایک دانشور کہتا ہے کہ ذرا سوچیے کہ تخلیق انسانی سے پہلے انسان بنانے والے "خالق" کے خیال میں تھا، پھر اس کی تخلیق کی گئی۔ جو یہ جان جائے کہ میں قیمتی ہوں، دوسری مخلوقات سے بہت افضل ہوں، دوسری مخلوقات کا میں سردار ہوں، وہی اشرف المخلوقات کہلانے کا حق دار ہے۔ شعور یہ بتاتا ہے کہ ہم عام مخلوق نہیں ہیں۔ ہم بڑے انسان ہیں۔ ہم بڑے کام کیلئے آئے ہیں۔ دنیا میں صرف پیدا ہو جانا اور مر جانا زندگی نہیں ہے۔ جب یہ بات حضرت علامہ اقبالؒ کو سمجھ آئی تو وہ فرماتے ہیں، "تقدیر کے پابند ہیں نباتات و جمادات۔۔۔ مومن فقط احکام الٰہی کا ہے پابند!" تقدیر تو نباتات کیلئے ہے۔ انسان تو تقدیر لکھنے والا ہے۔ کائنات کے اس نظام میں اللہ تعالیٰ یہ نہیں دیکھتا کہ ہم غریب ہیں، کس کے بیٹے ہیں، کالے ہیں، گورے ہیں، ذات کیا ہے، برادری کیا ہے۔ وہ صرف ایک چیز دیکھتا ہے کہ جو دستک دے رہا ہے، جو کوشش کر رہا ہے، جو محنت کر رہا ہے، جو آنسو بہا رہا ہے، جو خون پسینا ایک کر رہا ہے، اس کیلئے وہ حرکت میں آ جاتا ہے۔ قوانین انسان کیلئے ہیں۔ جب کوئی دل سے اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتا ہے تو پھر وہ چمکتا ہے۔ پھر محنت میں مل کر ہیرا بن جاتا ہے۔ (کتاب "بڑی منزل کا مسافر" سے)

زندگی کی سمت

ہم زمانہ طالب علمی سے ہی موٹیویشن کے ذرائع تلاش کرتے ہیں۔ جو آدمی بغیر کسی ذرائع کے موٹیویشن لے رہا ہے، یہ اس کی خوش قسمتی ہے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ بعض لوگوں کو زیادہ ذہانت دیتا ہے، اسی طرح بعض کو موٹیویشن بہت زیادہ دے دیتا ہے۔ پھر ان کی موٹیویشن زمانے کو ملتی ہے۔ کئی لوگوں کو افکار زیادہ ملتے ہیں۔ ان کی سوچ اور فکر بہت اچھی ہوتی ہے جیسے حضرت علامہ اقبالؒ جن کی فکر سے زمانہ فیض یاب ہو رہا ہے۔ اسی طرح حضرت واصف علی واصفؒ کے نازل ہوئے جملے جن سے زمانے کو فیض مل رہا ہے۔ ایسے لوگ معاشرے کیلئے ذہنی آکسیجن کا کام کرتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جنہوں نے اپنی زندگی میں اپنی سمت کا تعین کر لیا تھا۔

جب زندگی میں حکم بھی ہو کہ چلنا ہے اور کہیں پہنچنا ہے اور ساتھ یہ المیہ بھی ہوتا ہے کہ کچھ عرصے کیلئے ہم اردگرد کے لوگوں کے محتاج ہوتے ہیں۔ ہر جگہ سمت بتانے والے دوسرے لوگ ہوتے ہیں۔ ہم اپنی مرضی نہیں چلا سکتے۔ ان سمت بتانے والے لوگوں میں ہمارے والدین، ہمارے عزیز رشتے دار ہوتے ہیں۔ شروع میں ہمارے والدین اس سکول میں داخل کرائیں گے جن کے بارے میں ان کا خیال ہوتا ہے کہ اس کا معیار اچھا ہے۔ ہماری زندگی میں ہم کپڑے بھی اپنی مرضی کے نہیں پہنتے۔ ہمیں ایک عرصے تک لباس دوسرے لوگوں سے ملتا ہے۔

یہ اس لیے ہوتا ہے کہ ہم میں شعور نہیں ہوتا۔ شعور کی آنکھ ہمیں اس وقت ملتی ہے جب ہم محتاج نہیں رہتے۔ ہم آزاد ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ زندگی میں ہم آزاد بھی ایک دم سے نہیں ہوتے۔ ہم آہستہ آہستہ آزاد ہوتے ہیں۔ پھر خوش قسمتی یہ ہوتی ہے کہ ایک وقت وہ بھی آتا ہے کہ ہم مکمل آزاد ہو جاتے ہیں۔ کئی لوگ تو بڑی عمر میں بھی آزاد نہیں ہوتے۔ جب شعور کی آنکھ کھلنے لگے تو سب سے پہلا کام یہ کیجیے کہ باقاعدہ بیٹھ کر غور و خوض کر کے زندگی کو کوئی سمت ضرور دیجیے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس وقت ہمارے پاس جتنی زیادہ توانائی ہوتی ہے، اتنی توانائی کے ساتھ جو کام ہو سکتے ہیں، اگر وہ نہ کیے جائیں تو پچھتاوا رہ جاتا ہے۔ قدرت جتنے منٹس میری جیب میں ڈالتی ہے، اتنے ہی منٹس ہر ایک کی جیب میں ڈالتی ہے۔ وہ آدمی ترقی کر جاتا یا آگے بڑھ جاتا ہے جو اِن منٹس کو استعمال کرتا ہے۔ جو توانائی آپ کے پاس ہے، جب آپ رات کو سونے لگیں تو اپنے آپ سے یہ سوال کیجیے کہ کیا میں نے ان منٹوں کو بھرپور استعمال کیا ہے؟

آپ غلط گاڑی پر پندرہ منٹ بیٹھنا برداشت نہیں کر سکتے اور دس منٹ غلط راستے پر سفر نہیں کر سکتے۔ بالفرض، اگر آپ غلط سمت سفر بھی کر لیں تو پھر بھی دوسری گاڑی پکڑ کر اصل جگہ پر جایا جا سکتا ہے۔ اگر زندگی کے سفر میں کہیں غلط پہنچ گئے تو کیا وقت واپس آ جائے گا؟ کیا یہ ممکن ہے کہ کوئی بٹن دبایا جائے اور وقت واپس آ جائے؟ یہ ممکن ہی نہیں ہے۔ آپ کی عمر چاہے جتنی زیادہ کیوں نہ ہو، مگر جب سمت ٹھیک ہو جاتی ہے تو پھر کیا بات ہے۔ شیخ سعدیؒ سے کسی نے پوچھا، آپؒ کی عمر کتنی ہے؟ آپؒ نے فرمایا، ''چار سال۔'' اس نے کہا کہ آپؒ کے تو بال سفید ہو گئے ہیں۔ فرمانے لگے کہ ''مجھے شعور چار سال پہلے ملا ہے۔''

اگر شعور مل جائے تو پھر ایک ایسی زندگی جس میں سمت نہیں ہے، سمت آ جاتی ہے۔ اگر یہ کہا کہ آپ کی سو سال کی بے سمت زندگی سے ایک دن کی سمت والی زندگی زیادہ بہتر ہے تو غلط نہیں ہوگا۔ یہ جملہ اسی جملے سے مماثلت رکھتا ہے کہ ''شیر کی ایک دن کی زندگی گیدڑ کی سو سالہ زندگی سے بہتر ہے۔'' آپ کی سو سال کی زندگی ہو اور اس میں سمت نہ ہو تو اس سے بدرجہا بہتر ہے کہ صرف ایک دن کا جینا ہو جس میں سمت ہو، شوق ہو، جذبہ ہو، جس میں آپ کو کم از کم یہ یقین ہو کہ میرا دل میرے ساتھ ہے، میری روح میرے ساتھ ہے، میرے کام میں میری روح پوری طرح شامل ہے۔

آپ نے جس سمت کا انتخاب کر لیا ہے، خاموش ہو کر سر نیچا کر کے چلتے جائیں۔ ایک دن ایسا آئے گا کہ سر اٹھائیں گے اور زمانہ ساتھ چل رہا ہوگا۔ آپ حیران ہوں گے کہ میں تو اکیلا چلا تھا، اتنا بڑا کارواں کیسے بن گیا۔ سچا اکیلا بھی چلے تو زمانہ ساتھ چل پڑتا ہے اور جھوٹا زمانے کو لے کر بھی چلے تو ایک دن سب اس کا ساتھ چھوڑ جاتے ہیں۔ وہ اکیلا ہوتا اور ساتھ اس کے اس کا وہم ہوتا ہے۔ آپ نوکری کر رہے ہیں، کوئی حرج نہیں ہے، کاروبار کر رہے ہیں، کوئی حرج نہیں ہے، پڑھائی کر رہے ہیں، کوئی حرج نہیں ہے، لیکن خدارا سب کاموں کی سمت ایک ہو۔ سب چیزیں جڑ کر ایک دریا میں گریں۔ یہ نہ ہو کہ آپ کی

اپنی پہچان

جب کوئی سوال سنجیدہ ہوتا ہے تو وہ انجام کار عمل پر لاتا ہے۔ لیکن اگر سوال سنجیدہ نہیں ہے تو پھر وہ عمل کی طرف نہیں جاتا۔ خودشناسی بھی ایسا ہی ایک سنجیدہ سوال ہے۔ اگر آپ اس سوال کو دل میں رکھ لیتے ہیں اور غور و فکر شروع کر دیتے ہیں تو پھر اللہ تعالیٰ اس کا جواب اشاروں کی صورت میں دیتا ہے۔

دنیا کا کوئی انسان ایک دم سے اپنے آپ کو نہیں پہچان سکا۔ ایک شخص پیدا ہوا، کاروبار کے متعلق علم حاصل کرنے کی غرض سے یورپ گیا مگر وہاں جا کر وکالت کی تعلیم حاصل کر لی۔ بعد میں لیڈر بن گیا۔ دنیا اسے "قائداعظم" کے نام سے جاننے لگی۔ قدرت نے لازم کر دیا ہے کہ یہ راستہ ڈھونڈنے سے ہی ملے گا۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ آپ بٹن دبائیں اور آپ خود کو پہچان جائیں۔ کوشش لازم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کہا کہ تم چاہو گے، کوشش کرو گے تو پھر ملے گا۔ یہ خالق اور مخلوق میں فرق ہے۔ خالق "کن" کہتا ہے اور ہو جاتا ہے۔ ہم سوچتے ہیں، کہتے ہیں، کوشش کرتے ہیں، پھر ہوتا ہے۔

میں کون ہوں؟ میں کیا ہوں؟ اس سوال کا جواب شعوری کوشش مانگتا ہے۔ سجدے کرنے پڑتے ہیں، کئی جگہ بھاگنا پڑتا ہے۔ آپ کا اصل چہرہ کئی حادثات سے نکلتا ہے۔ کئی جگہ آپ کے اندر کا لالچ باہر نکل آتا ہے۔ آپ اپنے اندر ہاتھ ڈالتے ہیں تو سانپ نکل آتا ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ میرے اندر اتنا لالچ ہے۔ کبھی آپ اپنے اندر ہاتھ ڈالتے ہیں تو موتی نکل آتا ہے۔ آپ کہتے ہیں، میرے اندر اتنا خلوص ہے۔ آپ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں آنسوؤں کا نذرانہ پیش کرتے ہیں، وہ قبول ہو جاتا ہے۔ کبھی آپ اپنے اندر ہاتھ ڈالتے ہیں تو شیر نکل آتا ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ میں اتنا بہادر ہوں۔ پتا چلا کہ ساری چیزوں کو اپنے اندر تلاش کرتے کرتے آخر کار وہ اصل چیز مل جاتی ہے۔ اگر آپ اس سوال کے سفر میں بول پڑیں تو آپ کے منہ سے نکلتا ہے، "بولھا: کیہ جاناں میں کون؟" جب آدمی بن جاتا ہے تو پھر اسے سمجھ آ جاتی ہے کہ "نہ میں اور نہ وہ" سفر میں اسے یہ سمجھ نہیں آتی کہ "میں موسیٰ ہوں کہ فرعون ہوں۔"

اگر کنارے کے قریب پہنچ جائیں تو پتا لگتا ہے کہ اصل میں، میں کون ہوں۔ پھر آپ اسی نام کے ساتھ انجام کی طرف چل پڑتے ہیں۔ اسی شناخت کے ساتھ دنیا سے چلے جاتے ہیں۔ (کتاب "بڑی منزل کا مسافر" سے)

ترجیحات کا تعین

ننانوے فیصد لوگ اپنی ترجیحات طے نہیں کرتے جس کی وجہ سے وہ فیصلہ نہیں کر پاتے۔ لوگوں کو پتا ہی نہیں ہوتا کہ اُن کیلئے ان کی زندگی کے لحاظ سے کیا اہم ہے اور کیا غیر اہم ہے۔ فیصلہ سازی اس شخص کیلئے بہت آسان ہوتی ہے جس نے اپنی ترجیحات طے کی ہوتی ہیں۔ ہاں اور ناں کرنا تب بہت آسان ہوتا ہے کہ جب ترجیحات کا پتا ہوتا ہے۔ زندگی گزارنا اہم نہیں ہے، ترجیحات کے ساتھ گزارنا بہت اہم ہے۔ پروفیسر احمد رفیق اختر فرماتے ہیں، ''دنیا میں خوش بخت انسان وہ ہے جو مناسب وقت میں اپنی ترجیحات کا تعین کر لے۔'' دنیا میں کوئی وقت مناسب نہیں ہوتا، جس وقت یہ احساس پیدا ہو جائے کہ مجھے اپنی ترجیحات کے مطابق زندگی گزارنی ہے، وہی وقت بہترین ہوتا ہے۔

اشوک کا دور تھا۔ دہلی، ملتان اور لاہور کے درمیانی علاقے کو ''کلنگ'' کہا جاتا تھا۔ اس نے اپنی بادشاہت قائم کرنے کیلئے اپنے ننانوے بھائی قتل کر دیے۔ قتل کرنے کے بعد جب وہ سپر پاور بن کر نکلا تو اس وقت کے پنڈت نے اس کے ماتھے پر ایک ٹیکا لگایا۔ جیسے ہی اس کو ٹیکا لگا، اسے ایک لمحے کو احساس ہوا کہ یہ میں نے کیا کر دیا۔ صرف ایک ٹیکا ماتھے پر سجانے کیلئے میں نے اپنے ننانوے بھائی قتل کر دیے۔ اس نے اپنے ماتھے پر سے یہ ٹیکا مٹا دیا۔ اسی وقت اپنی تلوار گرا دی اور اپنی باقی زندگی خدمت میں گزار دی۔ عام طور پر جب بھی بندہ اپنی بے عزتی محسوس کرتا ہے تو وہ اپنا ماتھا صاف کرتا ہے، یعنی وہ اپنے کلنگ کے ٹیکے کو صاف کرتا ہے۔

جو آدمی کبھی بھی زندگی کی ترجیحات کا تعین کر لیتا ہے، پھر وہ عام نہیں رہتا۔ وہ بہتر زندگی گزارنے والا بن جاتا ہے۔ ترجیحات کے تعین کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی زندگی میں کیا، کتنا اور کیوں اہم ہے۔ ممکن ہے، کسی کیلئے فیملی اہم نہ ہو، مگر ایک لمحے کیلئے سوچیں کہ فیملی کتنی اہم ہوتی ہے۔ ممکن ہے، کسی کیلئے صحت اہم نہ ہو، ترجیحات کا تعین بتاتا ہے کہ صحت کتنی ضروری ہے۔ ممکن ہے، کسی کیلئے دوست، محبت، اخلاص اہم نہ ہو مگر جو ترجیحات کا تعین کرتا ہے، وہ جانتا ہے کہ اس کیلئے ان کی بھی اہمیت ہے۔ ممکن ہے، آپ کی زندگی میں سب مادی چیزیں ہوں، مگر مالک کے ساتھ تعلق کا احساس نہ ہو۔ ممکن ہے، آپ کی زندگی میں شہرت ہو، لیکن امن نہ ہو۔

جاوید چوہدری کہتے ہیں، ''جو آدمی ایک پیالی چائے سے لطف اندوز نہیں ہو سکتا، اسے کپ انجوائے نہیں کر سکتا، اسے امن نہیں مل سکتا۔'' ہم کتنے مہنگے کھانے کھاتے ہیں، مگر انھیں محسوس نہیں کرتے۔ ہم کبھی اپنے بچے کی معصومیت کو محسوس نہیں کرتے۔ کتنے ہی لوگ گیلے گھاس پر چلنا بھول چکے ہیں، کیونکہ انھوں نے گیلے گھاس پر چلنا محسوس ہی نہیں کیا ہوتا۔ ہمارے احساس میں یہ چیز آئی ہی نہیں کہ ہمارے پاؤں کے تلووں پر کبھی گیلا گھاس بھی لگا تھا۔ ہم زندگی میں اپنے بچپن کی چھوٹی چھوٹی یادیں بھول جاتے ہیں اور ترجیحات کے بغیر زندگی گزار دیتے ہیں۔ (کتاب ''بڑی منزل کا مسافر'' سے)

دولت کے راز

لوگ امیر ہونا چاہتے ہیں، وہ زیادہ سے زیادہ دولت حاصل کرنے کے خواہش مند رہتے ہیں۔ لیکن، حقیقتاً امیر وہ شخص ہے جس نے اپنے اندر کے خزانے کو دریافت کرلیا ہو، جس نے خود کو تلاش کرلیا ہو۔ جس شخص نے اپنی صلاحیتوں کو استعمال کیا اور بہتر نتیجہ دیا، وہ شخص امیر ہے۔ امارت کا تعلق بینک بیلنس، پُرتعیش طرز حیات، مال و اسباب کی زیادتی، بڑے مکان یا نئی گاڑی کے ساتھ نہیں ہوتا بلکہ اس کا تعلق اپنی تلاش کے ساتھ ہے۔ ہر شخص کسی نہ کسی خواہش کے ساتھ زندگی گزارتا ہے۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ خواہش نہ ہو۔ چنانچہ جس کے پاس نوکری نہیں، وہ نوکری تلاش کررہا ہے، جسے مل گئی ہے، وہ اچھے عہدے پر جانا چاہتا ہے، جو عہدے پر ہے وہ اس سے بڑا عہدہ لینا چاہتا ہے۔ کوئی ملک چھوڑنا چاہتا ہے تو کوئی ملک واپس آنا چاہتا ہے۔ کوئی پسند کی شادی کرنا چاہتا ہے تو کوئی پسند کی شادی کے فیصلے پر پشیمان ہے۔ انسان اس دنیا میں جتنی بھی خواہشیں رکھتا ہے، وہ تمام اس کے اندر ہوتی ہیں۔ المیہ یہ ہے کہ انسان اپنے اندر پڑے ہوئے خزانے کو تلاش کیے بغیر ان خواہشوں کی تکمیل کرنا چاہتا ہے۔

ہمارے ہاں نوجوان اس لیے تعلیم حاصل کرتے ہیں کہ تاکہ وہ امیر ہوجائیں، لیکن وہ تعلیم جو اِن نوجوانوں کو خودشناس کردے، اس تعلیم سے وہ محروم ہیں۔ دنیا میں انسانوں کی اکثریت اپنے دماغ، اپنی خداداد صلاحیتیں استعمال کیے بغیر قبرستان تک پہنچ جاتی ہے۔ یہ وہ دماغ ہوتے ہیں جنھوں نے اپنے آپ کو کبھی تلاش نہیں کیا۔

کیا آپ کو یہ ادراک ہے کہ مصنوعہ (پروڈکٹ) اہم نہیں ہوتی، مشین اہم ہوتی ہے، کیونکہ مصنوعہ اگر ضائع بھی ہوجائے تو مشین سے اس چیز کو دوبارہ تیار کیا جاسکتا ہے۔ جو نتیجہ دے رہا ہے، وہ خواہ پیسے کی شکل میں ہو، شہرت کی شکل میں ہو یا آسانیوں کی شکل میں ہو، اصل میں وہی Millionnaire ہے۔

امیر لوگ امیر کیوں تھے؟

ہم قابلیت کے بغیر نتیجہ چاہتے ہیں۔ ہر ٹرینر چاہتا ہے کہ ٹونی روبنس اس کے گھٹنوں کو ہاتھ لگائے۔ ہر کاروباری شخص چاہتا ہے کہ کسی دن بل گیٹس اس سے وقت مانگے۔ ہر دانشور چاہتا ہے کہ لوگ ٹکٹس لے کر مجھے سنیں۔ یہ سب خواہشیں ہیں جو ہر شخص میں پائی جاتی ہیں اور ہر شخص اپنے اندر کے میلینیر کو جانے بغیر یہ خواہش پوری کرنا چاہتا ہے۔ وہ جو کہا جاتا ہے کہ دل دریا سمندروں ڈھونگے، یہ اصلی دولت مند ہے۔ اپنی اندر جھاتی مارنے والا امیر ہے۔ اپنے من میں ڈوب کر جو سراغ زندگی پاتا ہے، وہ دنیا میں خوش حال رہتا ہے۔ تیرے اندر آپ حیاتی ہو، کا راز جاننے والا میلینیر ہے۔ اپنے اندر کے اس میلینیر کو دریافت کیے بغیر ممکن نہیں کہ کوئی بڑا شاعر بن جائے، بڑا دانشور بن جائے، بڑا بزنس مین بن جائے یا بڑا قلم کار بن جائے۔

جن لوگوں نے ادارے بنائے، جنھوں نے ملک بنائے، جنھوں نے بڑے کام کیے، وہ حقیقتاً امیر لوگ ہیں۔ مثلاً قائد اعظم محمد علی جناحؒ نے پاکستان بنایا۔ یہ بالکل درست بات ہے۔ کبھی آپ نے ان کی جناحؒ سے قائد اعظمؒ بننے تک کی کہانی پڑھی ہے؟ آپ یہ سوانح پڑھیں تو پتا چلے گا کہ وہ کتنے بڑے میلینیر تھے۔ اسی طرح، شیکسپیئر میلینیر ہے۔ حضرت بابا بلھے شاہؒ میلینیر ہیں۔ حضرت علامہ اقبالؒ میلینیر ہیں۔ حضرت وارث شاہؒ میلینیر ہیں۔ غالب میلینیر ہے۔ فیض میلینیر ہے۔ یہ وہ تمام لوگ ہیں جنھوں نے اپنے اندر ''جھاتی'' ماری اور اپنے اندر کا خزانہ تلاش کیا۔

دولت کا مفہوم

یہ بات ہمیں اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ میلینیر کا مطلب یہ نہیں کہ جس کے پاس خوب پیسہ ہو یا بڑی بڑی جاگیریں ہوں۔ اگر آپ کے خیال میں ''دولت مند'' یا Millionnaire کی تعریف یہی ہے تو آپ غلط فہمی میں ہیں، آپ کو اپنی معلومات درست کرنے کی ضرورت ہے۔ ایسا ممکن ہے کہ کسی کو پیسہ کمانے کی انتہائی خواہش ہو تو اس کیلئے میلینیر بننے کیلئے پیسہ ضروری ہے۔ عین ممکن ہے کہ کسی کی خواہش پیسہ نہ ہو تو اس کیلئے میلینیر ہونا کچھ اور ہوگا۔ یہ جاننا

بہت ضروری ہے کہ اصل میں میلینیر کیا ہے۔

ہر ایک کا راستہ جدا ہے۔ ہر فرد کی منزل الگ ہے۔ کوئی کھیل میں چیمپئن بننا چاہتا ہے تو کسی کیلئے ٹاپ کرنا کمال ہے۔ کسی کیلئے منفرد کاروبار اہم ہے (خواہ اس میں زیادہ پیسہ نہ ہو) تو کوئی لکھاری یا ٹریننر کے اعلیٰ ترین مقام پر پہنچنا چاہتا ہے۔ غرض، ہر شخص کی خواہش جدا ہے۔

دنیا میں کام کرنا اتنا اہم نہیں ہوتا بلکہ اہم یہ ہوتا ہے کہ کون سا کام کرنا ہے۔ استقامت میں برکت ہے، مگر اس سے بھی اہم یہ نکتہ ہے کہ آپ وہ کام مستقل مزاجی کے ساتھ کریں جو آپ کی جبلت اور فطرت کے مطابق ہو۔ یہ وہ کام ہے جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اس دنیا میں بھیجا ہے۔ کیا آپ نے اپنے سے کبھی یہ سوال کیا ہے کہ "میں جو کام کر رہا ہوں، کیا وہ میری جبلت کے مطابق ہے کہ نہیں ہے؟"

اگر قدرت نے کسی کو بزنس مین بنایا ہے اور وہ تدریس میں سر توڑ کوشش کرتا ہے تو وہ فیل ہو جائے گا۔ لیکن اگر قدرت نے اسے بنایا ہی تعلیم کیلئے ہے تو وہ چاہے بزنس میں پی ایچ ڈی ہی کیوں نہ لے لے، وہ ایک دکان بھی نہیں چلا سکتا۔ نوجوانوں کی کتنی بڑی تعداد آپ کے گرد ایسی ہے جو لیڈرشپ کی ڈگری لیتی ہے، لیکن ساری زندگی ملازمت کرتی رہتی ہے۔

خودشناسی طویل عمل ہے

خود کو جاننا ایک لمحے کی بات نہیں ہے۔ یہ ایک سفر کا نام ہے۔ تاہم، یہ ممکن ہے کہ ایک نشست میں اس سفر کا آغاز ہو اور اس کا انجام پانچ سال بعد آئے لیکن پہلا قدم اٹھانا اور چلنا پہلا کام ہے۔ یہ اہم نہیں کہ مجھے کہیں جانا ہے، بلکہ اہم تر یہ ہے کہ مجھے جانا "کہاں" ہے؟ یہ اہم نہیں ہے کہ مجھے منزل کا انتخاب کرنا ہے بلکہ اہم تر یہ ہے کہ میرے لیے "کون سی" منزل مناسب ہے؟

ان سوالوں کے جواب دو بنیادوں پر تلاش کیے جاتے ہیں۔ اول، ہمارا دماغ کیا کہتا ہے؛ دوم، ہمارا دل کیا کہتا ہے۔ پاکستانی قوم یہ سنتی ہے کہ دل کیا کہتا ہے، لیکن دماغ کیا کہتا ہے، شاید یہ کبھی نہیں سنا۔ دل سے جنون لینا چاہیے، ہم دل کی سنتے ہیں اور دماغ سے جنون چاہتے ہیں، حالانکہ دماغ کے پاس جنون نہیں ہوتا۔ اگر ان دونوں کا متوازن استعمال کیا جائے اور پھر کسی ماہر مشاور سے مشورہ کر لیا جائے تو آپ زندگی کے بہت سے مسائل سے خود کو بچانے کے قابل ہو سکتے ہیں۔ آپ اپنے اندر کے خزانوں کو دریافت کر کے اپنی دنیا کے میلینیر بن سکتے ہیں۔ (زیرِ طبع کتاب "سوچ کا ہمالیہ" سے)

خود کو کیسے فتح کیا جائے؟

روحانیت میں خود کو فتح کرنے کے حوالے سے دیکھا جائے تو کوئی بھی روایتی خانقاہی نظام ہو، اس میں کچھ ایسی ڈیوٹیاں سالک کے ذمہ لگائی جاتی ہیں جن سے نفس کی اصلاح کی جا سکے، مثلاً جھاڑو لگانا، چائے پلانا، جوتیاں سیدھی کرنا، لنگر تقسیم کرنا وغیرہ۔ ان تمام کاموں کا مقصد تہذیب نفس ہوتا ہے۔ اس کا قطعی مطلب یہ نہیں ہوتا کہ کسی کی عزت کم کی جا رہی ہے یا کسی کو سر پر بٹھایا جا رہا ہے۔ جب کسی کا جھوٹا برتن دھویا جاتا ہے تو بقول سید سرفراز شاہ صاحب، ''نفس کی ٹھان بیٹھ جاتی ہے۔'' اس سے نفس مرتا ہے۔ جب کسی کی جوتی کو سیدھا کیا جاتا ہے تو اس سے عاجزی پیدا ہوتی ہے۔ جب لنگر تقسیم کیا جاتا ہے تو اچھی بوٹیاں پہلے تقسیم کی جاتی ہیں۔ جب سارا کھانا تقسیم کرنے کے بعد کھانا تقسیم کرنے والے کی باری آتی ہے تو اس وقت اس کی بھوک ختم ہو چکی ہوتی ہے، کیونکہ جو دل سے بانٹتا ہے، اس کے نفس کی تہذیب شروع ہو جاتی ہے۔ یہ سب اس لیے کیا جاتا ہے کہ بندے کے اندر وسعت پیدا ہو، بندہ سخی بن جائے اور روح نفس پر غالب آ جائے۔

وہ تمام کام جو روحانیت سے جڑے ہوتے ہیں، اگر ان کو شروع کر دیا جائے تو روح طاقت ور ہونا شروع ہو جاتی ہے۔ ذکر بھی انسان کی روح کو طاقت ور کرتا ہے، لیکن اس میں یاد رہے کہ ذکر، شعوری ہو۔ اگر شعوری طور ''یا حی یا قیوم'' پڑھا جائے تو زیادہ اثر پڑتا ہے، بہ نسبت اس کے کہ ذکر بھی ہو رہا ہو اور دھیان دوسری طرف ہو۔ اس کا اتنا اثر نہیں پڑے گا، اگرچہ ثواب مل جائے گا۔

جو لوگ کائنات پر غور و خوض کرتے ہیں، ان کی روح کو بھی توانائی ملتی ہے۔ جو لوگ روحانیت کی طرف بڑھتے ہیں، ان کی روح قوی ہوتی ہے۔ جو لوگ سخی ہوتے ہیں، ان کے بارے میں قرآن پاک میں ارشادِ گرامی ہے کہ ''وہ بے خوف ہوتے ہیں۔'' دو ہی جگہ پر بندہ بے خوف ہوتا ہے، ایک اللہ تعالیٰ کا دوست بن کر اور دوسرا اللہ تعالیٰ کیلئے بانٹ کر۔

جب بھی اپنے آپ کو فتح کرنا چاہیں تو اپنی بہترین شے اللہ تعالیٰ کی ذات کیلئے دیجیے۔ جب آپ ایسا کریں گے تو نفس آہستہ آہستہ آپ کے اختیار میں آئے گا۔ آپ محسوس کریں گے کہ آپ نے خود کو فتح کرنا شروع کر دیا ہے۔

دوسری پیدائش

سچے انسان میں صحیح فیصلہ کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے اور جو انسان جھوٹا ہوتا ہے، وہ صحیح فیصلہ نہیں کر پاتا بلکہ کنفیوژ رہتا ہے۔ اگر فیصلہ صحیح ہو بھی جائے تو اس میں برکت نہیں ہوتی۔ جو انسان سچا ہوتا ہے، اس کا اللہ تعالیٰ پر ایمان پختہ ہوتا ہے اور اس کے فیصلے میں اس کا یقین شامل ہوتا ہے جس کی وجہ سے اس کے فیصلوں میں اللہ تعالیٰ کی مدد شامل ہو جاتی ہے۔ لوگ چھے چھے دفعہ انٹری ٹیسٹ دیتے ہیں، مگر کامیاب نہیں ہوتے۔ قدرت اشاروں سے انھیں سمجھا بھی رہی ہوتی ہے کہ اِدھر راستہ بند ہے، کوئی اور راستہ ڈھونڈو۔ مگر پھر بھی وہ اسی راستے پر رہتے ہیں۔ ان کے اس راستے پر رہنے کی وجہ ان کی ضد ہوتی ہے اور جو ضدی ہوتا ہے، اس کے ترقی کرنے کے مواقع کم ہوتے ہیں۔ جس فرد میں لچک ہوتی ہے وہ اپنے مالک کو پکارتا ہے اور کہتا ہے، میرے مالک، جو تیری مرضی ہے، وہی میری مرضی ہے۔ میں تیرے فیصلوں پر راضی ہوں۔ میرے مالک، میرے لیے آسانیاں پیدا فرما۔

اکبر بادشاہ نے بیربل کو کہا کہ کوئی ایسا جملہ کہو، جو ہر لحاظ سے مکمل ہو اور ہر صورتِ حال میں پورا اترے۔ بیربل بولا، ''یہ وقت بھی گزر جائے گا۔'' اس نے کہا کہ اگر آپ اس فقرے کو غم کے دوران کہیں گے تو آپ کو خوشی ہوگی اور اگر آپ خوشی میں کہیں گے تو پتا چلے گا کہ یہ سچ ہے کہ خوشی نے بھی چلے جانا ہے۔

غور کیجیے اور اپنے آپ سے سوال کیجیے کہ میں کیوں پیدا ہوا ہوں۔ میرا یہاں آنے کا کیا مقصد ہے۔ آپ کی تخلیق الل ٹپ نہیں ہے۔ آپ کو کسی خاص مقصد کیلئے اس دنیا میں بھیجا گیا ہے۔ آپ تو آپ ہی ہیں۔ یہ ہو نہیں سکتا ہے کہ اتنا بڑا مالک کائنات آپ کو بلا کسی مقصد کے اس دنیا میں بھیج دے۔ حضرت امام مالکؒ فرماتے ہیں، ''انسان کی دو پیدائشیں ہیں۔ ایک جس دن وہ پیدا ہوتا ہے اور دوسرا جس دن وہ ڈھونڈ لیتا ہے کہ میں کیوں پیدا ہوا ہوں۔'' دوسری پیدائش پہلی پیدائش سے زیادہ اہم ہے۔ یہ جن لوگوں کی زندگی میں آجاتی ہے تو وہ کار آمد ہو جاتے ہیں۔ حدیث مبارک کا مفہوم ہے کہ ''وہ شخص بہترین ہے جو دوسروں کیلئے فائدہ مند ہے۔'' جس دن آپ دوسروں کیلئے فائدہ مند بن جاتے ہیں تو سمجھ لیجیے کہ آپ نے جوازِ ہستی تلاش کر لیا۔

اگر آپ کی زندگی آپ کے اپنے ہی کام نہیں آ رہی تو پھر سمجھ لیجیے کہ ابھی تک آپ کو زندگی کا مقصد نہیں ملا۔ جوازِ ہستی تلاش کرنے کیلئے تہجد لگائیں، روئیں، اس رب العالمین کے دروازے پر دستک دیں، آپ کو جواب ضرور ملے گا۔ ہمیں اپنی ماں پر یقین ہوتا ہے، ہمیں وقت کے وزیر اعلیٰ پر یقین ہوتا ہے، مگر مالک کائنات پر یقین نہیں ہوتا۔ وہ جو کائنات کا مالک ہے، وہ کہتا ہے کہ تم مانگو، میں دوں گا۔ کیا عجب ہے کہ میں سب پر یقین رکھوں اور اپنے مالک اور خالق پر یقین نہ رکھوں۔ وہ تو ستر ماؤں سے زیادہ پیار کرنے والا ہے۔

سونے سے پہلے نیت کیجیے اور صبح اٹھ کر سجدے میں سر رکھ کر اللہ تعالیٰ سے التجا ضرور کیجیے کہ اے میرے مالک، اگر تو نے مجھے ماں کے پیٹ میں پالا ہے تو اب مجھے شعور عطا فرما کہ میں اس دنیا میں کیوں آیا ہوں۔ (کتاب ''بڑی منزل کا مسافر'' سے)

بدلتی عمر، بدلتی ترجیحات

ہم کبھی اپنی زندگی کے سفر میں پیچھے مڑ کر دیکھیں تو ہمیں یاد آئے گا کہ ایک ننھا منا سا بچہ جس کی معصومیت یہ تھی کہ وہ چھوٹی چھوٹی چیزوں سے خوش ہو جاتا، اس کے کھلونوں کی تعداد تھوڑی تھی مگر پھر بھی وہ ان سے راضی تھا۔ اگر کھلونا گم جاتا تو چند گھنٹوں بعد وہ مکمل طور پر بھول جاتا اور ایک نئی دنیا میں گم ہو جاتا۔ اس کو کوئی لالچ نہیں تھا، حرص نہیں تھا۔ اس کی خوشی یہ تھی کہ بڑی عید آ رہی ہے۔ اس کی خوشی یہ تھی کہ نیا جوڑا بن گیا ہے۔ اس کی خوشی یہ تھی کہ نئے کھلونے مل گئے ہیں۔ ایک تو یہ بچہ ہے جبکہ ایک شخص وہ ہے جو جوان ہوتا ہے، ایک وہ شخص ہے جو جوان ہو کر بوڑھا ہو جاتا ہے، اور ایک وہ شخص ہے جو بوڑھا ہو کر مرجاتا ہے۔

عمر کے بدلنے سے اپنے اندر کی تبدیلی کو دیکھئے تو وہ دراصل انتخاب کی تبدیلی نظر آتی ہے۔ ہم نے ہر دور میں انتخاب سے ظاہر کیا کہ ہماری عمر کیا ہے۔ اگر آج بھی کسی بوڑھے شخص کا انتخاب کھلونے ہوں تو لوگ کہیں گے کہ یہ بچہ ہے، یہ بڑا ہی نہیں ہوا، یعنی انتخاب اس بات کا اظہار ہے کہ یہ اپنی عمر میں کہیں پیچھے رہ گیا ہے۔ اس کی عمر میں تو بڑھ گئی ہے، لیکن ذہنی طور پر کچھ چیزیں پیچھے رہ گئی ہیں۔ ایک ہی انتخاب کسی اور وقت کے انتخاب پر لے کر جائیں تو پچھلا انتخاب ہمیں حماقت لگتا ہے۔ ہماری زندگی کے بے شمار ایسے واقعات ہوتے ہیں کہ جب کبھی ہمارے سامنے اُن کا ذکر ہوتا ہے تو ہمیں شرم آ جاتی ہے۔ اس لیے کہ یہ وہی ہماری ذات کا حصہ ہے جو پیچھے کہیں کٹ گیا تھا اور آج اس کو ماننے اور سننے کیلئے ہم تیار نہیں ہیں۔

ہمارے چوہے

سوال یہ ہے کہ کیا وہ اصل تھا؟ تو جواب ہے، نہیں۔ کیا اگلا مرحلہ اصل ہے؟ جواب ہے، نہیں۔ ہم لمحہ موجود کے سوا کسی لمحے کو مانتے ہی نہیں ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ہم جس شعور کی حالت میں موجود ہیں، یہی میں ہوں اور یہی درست ہے۔ کیا یہی آگہی ہے کہ میں کون ہوں، اور میرے باہر کے حالات بدل جائیں تو میرا جواب بدل جاتا ہے۔ یہ کیا بات ہوئی کہ تھوڑے سے حالات بدلنے سے اتنی بڑی تبدیلی آ جائے کہ ہم موسیٰ سے فرعون بن جائیں۔ جنگل میں بلی تقریر کر رہی تھی۔ تمام جانور سن رہے تھے کہ اسی دوران اس کے آگے سے چوہا گزرا۔ بلی نے تقریر چھوڑ دی اور چوہے کے پیچھے بھاگ گئی۔ صوفیا فرماتے ہیں کہ آدمی کے اندر ایک بلی ہوتی ہے اور ہر آدمی کا ایک چوہا ہوتا ہے۔ جیسے ہی وہ سامنے آتا ہے، وہ سب کچھ بھول جاتا ہے اور اس کا حقیقی اندر سامنے آ جاتا ہے۔ ہم ہر شعبے میں نیک ہوتے ہیں، لیکن ہمارا ایک شعبہ ایسا ہوتا ہے جس کو گرفت کرنے کے بعد سمجھ آتا ہے کہ وہ ''جن'' ہمارے اندر ہی ہے جسے قابو کرنا ہے۔ (زیرِ طبع کتاب ''سوچ کا ہمالیہ'' سے)

توانائی کا صحیح استعمال

قدرت بعض لوگوں کو بہت خوب صورتی سے نوازتی ہے۔ بعض کو بہت خوب سیرت بنا دیتی ہے۔ بعض کی شخصیت بہت پُرکشش بنادیتی ہے۔ غرض ہر کسی کو کسی نہ کسی انعام سے ضرور نوازتی ہے۔ قطب الدین ایبک کو "یوسف ثانی" کہا جاتا ہے۔ دنیا کی تاریخ میں حضرت یوسف علیہ السلام سب سے خوبصورت انسان مانے جاتے ہیں۔ ان کے بعد اگر کسی کو خوبصورت کہا گیا ہے تو وہ قطب الدین ایبک تھے۔ خوب صورتی سے زیادہ پُرکشش شخصیت اُن لوگوں کی ہوتی ہے جنھیں قدرت بہت زیادہ توانائی عطا کرتی ہے۔ وہ توانائی اتنی زیادہ ہوتی ہے کہ بڑے بڑے کام بھی ان کے آگے چھوٹے ہو جاتے ہیں۔ وہ اپنی اتھاہ توانائی کو استعمال کرتے ہوئے غیر معمولی کام کر جاتے ہیں اور پھر غیر معمولی بن جاتے ہیں۔ انھیں ہم موثر اور کامیاب لوگ کہتے ہیں۔ خدا کا فضل ہے کہ اس نے یہ غیر معمولی توانائی ہر ایک کو دے رکھی ہے۔ کوئی بھی اس سے محروم نہیں۔۔۔ آپ کے اندر بھی یہ توانائی کہیں چھپی ہوئی ہے!

زندگی میں ایک وقت ایسا آتا ہے کہ اسے یہ شعور ہوتا ہے کہ اس کے اندر توانائی کا آتش فشاں چھپا ہوا ہے۔ جب قدرت اسے یہ شعور دیتی ہے اور وہ اس شعور کی مدد سے اپنی تلاش شروع کرتا ہے تو وہ اپنے اندر موجود کائنات میں کسی جگہ یہ آتش فشاں بھی کھوج ڈالتا ہے۔ پھر وہ یہ فیصلہ کرتا ہے کہ مجھے اپنی زندگی میں کچھ کرنا ہے۔۔۔ کچھ غیر معمولی کرنا ہے تاکہ وہ اس توانائی کا درست استعمال کر سکے۔ یہ فیصلہ کرنے کے بعد وہ اپنی ساری توانائی اس کام پر لگا دیتا ہے۔ ایسا شخص حالات کیسے بھی ہوں، دیکھتے ہی دیکھتے باقی لوگوں سے آگے نکل جاتا ہے۔

لوگوں کی اکثریت زندگی میں ناکام رہتی ہے۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ شکایت کرتے ہیں کہ ہمیں سازگار حالات نہیں ملے، ہمارے والدین نے ہماری تربیت درست نہیں کی، ہمارا سیاسی اور قانونی نظام کرپٹ ہے۔ کیا یہ اعذار درست ہیں؟ اگر دیکھا جائے تو سازگار حالات تو نبیوں کو بھی نہیں ملے۔ دنیا میں کبھی بھی حالات سازگار نہیں رہے اور نہ ہوں گے۔ پودے کو زمین سے نکلنے کیلئے زمین کا سینہ چاک کرنا پڑتا ہے۔ آپ جب بھی آگے نکلنے کی کوشش کریں گے، دنیا آپ کو پاگل کہے گی لیکن آپ کو دنیا کی پرواہ کیے بغیر اپنی توانائی کا صحیح استعمال کرتے ہوئے آگے نکلنا ہوگا۔

جب آپ اپنی توانائی کا درست استعمال کریں گے تو سکون میں رہیں گے۔ اگر اسے دبا کر رکھیں گے تو بے سکون رہیں گے۔ کوشش کرکے اپنا شوق والا کام تلاش کیجیے۔ اگر وہ نہ ملے تو اللہ تعالیٰ سے دعا مانگیے۔ جس کے پاس توانائی زیادہ ہوتی ہے، اسے ٹکریں بھی زیادہ مارنی پڑتی ہیں، اسے سجدے بھی زیادہ کرنے پڑتے ہیں۔ چلتی چیز کا زیادہ ڈر ہوتا ہے کہ وہ کہیں ٹکرا سکتی ہے۔ اگر سمت اور منصوبہ بندی ہو تو توانائی والا انسان دوسروں سے آگے نکل جاتا ہے۔ بے شعور اور بے حس کو کبھی ٹینشن نہیں ہوتی۔ وہ کہتا ہے، اوہ۔۔۔ زندگی ختم ہوگئی، چلو فوت ہو جائیں۔ عقل والا اپنے اندر چھپی توانائی کو تلاش کرتا ہے اور پھر وہ یہ شعور حاصل کر لیتا ہے کہ مجھے زندگی ایک بار ملی، اس میں کچھ نہ کچھ ضرور کر کے جاؤ۔ پھر وہ اس فکر میں پڑ جاتا ہے کہ کیا اور کیسے کیا جائے۔

خودشناسی

بہت ہی معروف قول ہے، ''جس نے خود کو پہچانا، گویا اس نے خدا کو پہچانا۔'' خود کو جاننے کا مطلب یہ ہے کہ اگر میں کوئی کام کر رہا ہوں تو دیکھوں کہ اس کام کو کرانے والی کون سی ذات ہے۔ میں ایک ہی وقت میں دماغ ہوں، جسم ہوں، روح ہوں، دل ہوں، نفسہ امارہ ہوں، نفسہ مطمئنہ ہوں اور ایک ہی وقت میں نفسہ لوامہ ہوں۔ میں یہ دیکھوں گا کہ میرے کام کے پیچھے میرا محرک کیا ہے۔ جو محرک کام کرانے والا ہے، میں اسے تلاش کروں گا تو مجھ پر اپنی ذات پر کھل جائے گی۔

جب اس سوال کا جواب حضرت بابا بلھے شاہ کو آ گیا تو انھوں نے کہا، ''نہ میں موسیٰ نہ میں فرعون''، یعنی انھیں سمجھ آیا کہ میرے مسائل باہر کے مسئلے نہیں ہیں، یہ اندر کے مسئلے ہیں۔ گوتم بدھ جس کا اصل نام سدھارتھ تھا، اس کے متعلق ایک روایت مشہور ہے کہ وہ ایک درخت کے نیچے آلتی پالتی مار کر آنکھیں بند کر کے گیان میں بیٹھا رہتا تھا۔ ایک دن گیان کی حالت میں اس کی ہلکی سی آنکھ کھلی تو سامنے ایک خوبصورت لڑکی آتی ہوئی دیکھی۔ جب اس نے لڑکی کو دیکھا تو ایک لمحے کیلئے اس کے اندر کا شر جاگ اٹھا۔ اس کا خیال پراگندہ ہو گیا۔ اگلے ہی لمحے اسے خیال آیا کہ یہ ایسی مخلوق ہے جو خیال کو گندا کرتی ہے۔ پھر خیال آیا کہ نہیں، اس کا قصور نہیں ہے، میرے ہی اندر کچھ گندا ہے جس نے سر اٹھا لیا تھا۔

جب آپ اپنے اندر دیکھتے ہیں تو آپ کو سمجھ آتا ہے کہ میرے ہی اندر موسیٰ اور فرعون ہے۔ اندر ہی آپ حیاتی ہے، اندر ہی چودہ طبق ہیں۔ اندر ہی رب کی ذات ہے، اندر ہی شیطان ہے اور اندر ہی وہ شے ہے جو یہ تمام فیصلے کراتی ہے۔

تقدیر میں فیصلہ کرنے والا تقدیر پر اثر ڈال رہا ہوتا ہے۔ اگر فیصلہ آپ کا ہے تو ڈھونڈیے کہ وہ فیصلہ اندر سے کون کر رہا ہے۔ نفس کر رہا ہے تو ضلالت ہے۔ اگر وہ روح کا فیصلہ ہے تو سعادت ہے۔ زندگی میں ایک کام ضرور کیجیے۔ اپنے مختلف واقعات میں جا کر جھانکئے اور تصور کیجیے کہ اصل میں، میں کیا کر رہا ہوں۔ اس سے اپنی ذات کے بارے میں سمجھ بوجھ بڑھنا شروع ہو جائے گی۔

شوق یا پیسہ

عظیم پریم جی جو ہندستان کے بڑے کاروباریوں میں سے ہیں، کہتے ہیں،''میں اور میری کمپنی کبھی پیسے کے پیچھے نہیں بھاگے۔ہم ہمیشہ ساکھ کے پیچھے بھاگتے ہیں جس کی وجہ سے پیسہ ہمارے پیچھے بھاگتا ہے۔''

یہ الفاظ ایک کامیاب ترین کاروباری کے ہیں۔اس کے برخلاف ہمیں سکھایا ہی یہ جاتا ہے کہ تم اس لیے پڑھ رہے ہو تا کہ نوکری مل جائے۔لڑکی اس لیے پڑھ رہی ہے تا کہ اچھا رشتہ مل جائے۔جب ہمارے اہداف (ٹارگٹس) ہی اتنے چھوٹے ہوں گے تو پھر زندگی کہاں گزرے گی۔خدارا، اس کام کو کیجیے جس کیلئے اللہ تعالیٰ نے آپ کو پیدا کیا ہے تا کہ کام آپ کو کام نہ لگے۔اگر کام آپ کو کام لگے اور آپ کیلئے بوجھ بن جائے تو اس کا مطلب ہے کہ آپ اپنے شوق کو دریافت نہیں کر سکے ہیں۔آپ نے کاموں کا بوجھ اٹھایا ہوا ہے۔اور زندگی جس کیلئے بوجھ ہوتی ہے، وہ مُردہ ہوتا ہے۔صرف دفنانا باقی ہوتا ہے۔مشہور فلم''تھری ایڈیٹس'' کے آخر میں فوٹو گرافر اپنے والد سے کہتا ہے،''فادر! اِٹس اوکے۔۔۔پیسہ کم کمالوں گا، لیکن وہ کروں گا جس میں میری تسلی ہے، میرا جذبہ ہے۔''

یاد رکھیے، ہر ایک کے اندر میٹر لگا ہوا ہے جو یہ بتاتا ہے کہ آپ کا کام کیا ہے۔جو بتاتا ہے کہ آپ کو کدھر جانا ہے۔بعض اوقات زمانے کی تقدیر زمانے کے ہاتھ کی لکیر پر نہیں، آپ کے ہاتھ کی لکیر پر لکھی ہوتی ہے۔جناحؒ کے ہاتھ کو دیکھیں۔جناحؒ کے ہاتھ پر قوم کی تقدیر لکھی ہوئی تھی۔تقدیر آپ کو بدلنی ہوتی ہے۔آپ انتظار کر رہے ہوتے ہیں کہ کوئی مسیحا آئے اور تقدیر بدلے، جبکہ خدا نے آپ سے کام لینا ہوتا ہے۔عبدالستار ایدھی صاحب نہ ہوتے تو کتنے ہی لاوارث پڑے رہ جاتے، کتنے یتیم بے سہارا رہ جاتے۔وہ کتنوں کے باپ بن گئے، کتنوں کے جنازوں کے کفن بن گئے اور کتنوں کیلئے آسانی کا ذریعہ بن گئے۔

بعض اوقات ایک فرد پورے معاشرے کے معیار کو بدل ڈالتا ہے۔وہ Trendsetter کہلاتا ہے۔یہ ٹرینڈ سیٹر آپ بھی ہو سکتے ہیں۔آپ کو اندازہ ہی نہیں کہ آپ کے اندر کیا کچھ دفن ہے۔ایڈیسن دنیا میں واحد سائنس داں ہے جس کی ایجادات کی تعداد 1249 ہے جس میں ہم صرف بلب کو جانتے ہیں۔ایک بلب کی ایجاد کیلئے ایڈیسن نے دس ہزار سے زائد کوششیں کیں۔بیٹری بنانے کیلئے اس نے اس سے بھی زیادہ کوششیں کیں۔اس نے ایک جملہ کہا تھا، ''جس کو اپنے ٹیلنٹ کا پتا لگ جاتا ہے وہ ملازم نہیں ہو سکتا اور نہ وہ غلامی برداشت کرتا ہے۔'' غلام اور ملازم ہمیشہ وہ لوگ ہوتے ہیں جن کو اپنا پتا نہیں ہوتا۔وہ اپنے آپ کو سستا بیچ رہے ہوتے ہیں۔وہ اپنے آپ کو Pay Cheques پر چلا رہے ہوتے ہیں۔

اکثر لوگ اپنے شوق بدلتے رہتے ہیں۔وہ اپنے شوق اس لیے بدلتے رہتے ہیں کہ انھیں یہ شعور ہی نہیں ہوتا کہ اُن کا حقیقی شوق جو انھیں خدا کی طرف ودیعت کیا گیا ہے، کیا ہے؟ لیکن جب اپنا شوق واضح ہو جائے تو پھر وہ کبھی نہیں چھوٹتا۔

فرض کیجیے، کمرے میں اندھیرا ہے اور آپ باہر نکلنے کا راستہ تلاش کر رہے ہیں۔ اچانک آپ کا ہاتھ کھڑکی سے چھوا تو آپ سمجھے کہ یہی دروازہ ہے۔حالانکہ وہ دروازہ نہیں ہے۔اسی طرح آپ جس چیز کو راستہ سمجھتے ہیں، وہ راستہ نہ ہو تو آپ کنفیوژ ہو جائیں گے۔یہ کنفیوژن تب پیدا ہوتی ہے کہ جب آپ کی زندگی میں کوئی روشنی نہیں ہوتی۔جب اپنی ذات کے بارے میں شعور بڑھتا ہے تو پتا چلنا شروع ہو جاتا ہے کہ مجھے اس دنیا میں کیا کرنا ہے۔جو فرد فائل چوائس پر چلا جاتا ہے، اس کیلئے چوائس ختم ہو جاتی ہیں۔آخر کار، وہ ایک چیز کا انتخاب کرتا ہے اور کہتا ہے کہ بس اب کشتیاں جلا دو۔کشتیاں وہی جلائے گا جس کو اپنی منزل کا پتا ہوتا ہے کہ میرا یہی کام ہے۔

عام طور پر، انسان کی وقتی موٹیویشن بہت زیادہ ہوتی ہے۔آپ کا کام یہ ہے کہ اس غیر معمولی توانائی سے فیصلہ کن کام لیں۔طے کر لیجیے کہ آپ کو اپنی زندگی میں آج کے بعد کیا کرنا ہے۔پھر، دنیا کو وہ کر کے دکھا دیجیے۔(کتاب''بڑی منزل کا مسافر'' سے)

شوق کی پہچان کا فارمولا

شوق کی پہچان کا طریقہ یہ ہے کہ دوسروں سے مشورہ لینے سے پہلے اپنے آپ سے مشورہ کریں۔اپنے آپ سے مشورہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اپنے

دل کی آواز سنیں۔ جب آپ اپنے دل کی آواز سنیں گے تو آپ کو اندر سے آواز ضرور آئے گی کہ آپ اچھے انجینئر نہیں ہیں، بلکہ آپ اچھے بزنس مین ہیں۔ حضرت امام مالکؒ فرماتے ہیں، ''انسان کی دو پیدائشیں ہیں۔ ایک پیدائش جس دن وہ اپنی ماں کے پیٹ سے دنیا میں آتا ہے۔ دوسری پیدائش جس دن اسے اپنے پیدا ہونے کا مقصد پتا چل جاتا ہے۔'' عبدالستار ایدھیؒ مرحوم دوبار الیکشن میں کھڑے ہوئے اور دونوں بار ہار گئے۔ اگر وہ الیکشن جیت جاتے تو عبدالستار ایدھی نہ بن پاتے۔ حضرت اقبالؒ نے مقابلے کا امتحان دیا۔ اگر آپؒ کامیاب ہو جاتے تو علامہ اقبالؒ نہ بنتے۔

جتنے بھی بڑے لوگ بنے ہیں، وہ بہت سی ناکامیوں کے بعد کامیاب ہوئے ہیں۔ آدمی کو درست جگہ پر پہنچنے کیلئے ٹھوکریں کھانی پڑتی ہیں۔ ہمارے تعلیمی نظام کی سب سے بڑی غلطی یہ ہے کہ اسٹوڈنٹ نمبروں میں تو ٹاپ کر جاتا ہے، لیکن زندگی میں فیل ہو جاتا ہے۔ کیونکہ وہ جو بنتا ہے، وہ اپنے لیے نہیں بنتا بلکہ وہ معاشرے کا ٹرینڈ دیکھتا ہے کہ اگر دوسروں کے گال سرخ ہیں تو میرے بھی سرخ ہونے چاہئیں۔

ہم جس طرح کے لوگوں سے متاثر ہوتے ہیں، انھی کا سا رجحان ہم اختیار کرتے ہیں۔ یہاں ہمارے فطری مزاج اور معاشرے کے انداز میں تصادم ہوتا ہے۔ ہم اپنے اندر سے کچھ ہوتے ہیں اور سماج کی دیکھا دیکھی کچھ اور کرتے ہیں۔ یہ دوغلا پن ہماری زندگی سے ہماری خوشی اور سکون چھین لیتا ہے۔

لوگوں کو نہ دیکھئے کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔ ٹیوی ڈراموں اور فلموں کے ہیروؤں کے کاموں سے بھی متاثر نہ ہوں۔ آپ جیسا کوئی دوسرا نہیں۔ اپنے اندر اپنی تلاش کیجیے۔ اپنے دل کے اندر جھانکئے اور کھوجئے کہ آپ کا رجحان کس طرف ہے۔ حضرت واصف علی واصفؒ فرماتے ہیں: ''جو تیرا خیال ہے، وہی تیرا حال ہے۔''

خود اور خود شناسی

ہماری ذات خوبیوں اور خامیوں کا مجموعہ ہے۔ جو خوبی ہماری شناخت بنتی ہے، اس سے دوام ملتا ہے۔ یہ قدرت کا انعام ہوتا ہے۔ اس خوبی کو ہمیں لے کر چلنا ہوتا ہے۔ قدرت اپنے کارخانے کو چلانے کیلئے ہر انسان میں کچھ ایسی صفات رکھ دیتی ہے کہ کائنات میں جو کمی ہوتی ہے، وہ اس سے پوری ہو جاتی ہے۔ کائنات کا یہ نظام چلتا آرہا ہے اور چلتا رہے گا۔ ہم نے پچھلے لوگوں کی جگہ لی، پھر ہماری جگہ اور لوگ لے لیں گے۔ لیکن آج کے وقت میں ہمارا موجود ہونا اس بات کی علامت ہے کہ اس نظام میں ہماری ضرورت ہے اور اس ضرورت کو پورا کرنے کیلئے ہمیں یہ زندگی عطا کی گئی ہے۔

انسان میں یہ تجسس رہتا ہے کہ میں خود کو جانوں، مجھے جانا جائے۔ وہ یہ بھی چاہتا ہے کہ مجھ میں ابھی جو کمی ہے، ابھی جو کچھ باقی ہے اسے مکمل کرنا ہے۔ یہ تجسس ''خود شناسی'' کہلاتا ہے۔ یہ تجسس عمر کے کسی بھی حصے میں کسی کے دل میں بھی سما سکتا ہے۔ یہ سوال کبھی بھی اٹھ سکتا ہے کہ میں کون ہوں، میں کدھر جا رہا ہوں اور مجھے جانا کہاں ہے۔ تاریخ میں جن لوگوں نے خود کو جانا، وہ صوفیائے کرام ہو سکتے ہیں، وہ اولیائے کرام ہو سکتے ہیں، وہ نیک لوگ ہو سکتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ لوگ بھی ہو سکتے ہیں جنھوں نے معاشرے کیلئے کوئی کام کیا۔ مثال کے طور پر، اگر آئن سٹائن کا نام لیا جائے تو اس کی دریافتیں معاشرے کیلئے بہت فائدہ مند ثابت ہوئیں۔ اس کی شناخت علم سے جڑی ہے۔ یہ اُس کے اندر کی خودی تھی۔ وہ کہا کرتا تھا کہ میری دریافت کا عمل اس طرح ہے کہ جب میں کسی چیز کی دریافت کے پیچھے پڑ جاتا ہوں اور وہ ہو جاتی ہے تو اگلے کام کی طرح پچھلا کام بھول جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ میں سوچتا بھی نہیں ہوں کہ اس سے پہلے میں نے کوئی کام کیا تھا۔ میں جو کام کر رہا ہوتا ہوں، وہ میرے لیے نیا کام ہوتا ہے۔ میں اپنی پوری توانائی اس میں لگا دیتا ہوں۔

مشکلات و مصائب نعمت ہیں

جن لوگوں کے بارے میں یہ سمجھا جاتا ہے کہ انھوں نے خود کو جان لیا، یہ وہ لوگ تھے جنھوں نے خود کو جان لینے کے بعد وہ کام کیا جس کیلئے وہ پیدا کیے گئے تھے۔ عام طور پر خود کو جاننے والا شخص خود کو اس وقت جانتا ہے کہ جب وہ مصیبت و آلام میں مبتلا ہوتا ہے۔ جتنی خود شناسی انسان کو تکلیف میں ہوتی ہے، اتنی خوشی اور راحت میں نہیں ہوتی۔ غم، تکلیف اور مشکلات کا دور انسان کو اپنے آپ سے آگاہ کرتا ہے۔ حضرت واصف علی واصفؒ فرماتے ہیں، ''جس کی آنکھ میں آنسو ہیں وہ خدا کی رحمت سے بچ نہیں سکتا۔'' خدا کی رحمت سب سے پہلے اس شخص کیلئے ہوتی ہے جس کی آنکھ میں آنسو ہوں، کیونکہ اس وقت دل شکستہ اور ٹوٹا ہوا ہوتا ہے اور شکستہ دل نرم ہوتا ہے۔

عبدالستار ایدھی جب پیدا ہوئے تو ابتدائی ایام ہی میں ان کی والدہ کو طلاق ہو گئی جس کی وجہ سے اُن پر غربت اور غم کے سائے رہتے تھے۔ اسی کسمپرسی کی حالت میں وہ والدہ کے ساتھ پاکستان آ گئے اور کراچی میں گولیاں ٹافیاں بیچنا شروع کر دیں۔ لیکن اندر یہ جذبہ تھا کہ جس محرومی کا مجھے سامنا رہا، اس کا ازالہ مجھے دوسروں کیلئے کرنا ہے۔ لہٰذا، انھوں نے اپنی ریڑھی سے کام شروع کر دیا اور پھر ایک وقت ایسا آیا کہ ان کا نام گینز بک آف ورلڈ ریکارڈ میں درج ہوا۔ اُن کے بچپن کی محرومی اُن کی طاقت بن گئی۔ انھوں نے خود کو جان لیا کہ میں دوسروں کی خدمت کیلئے پیدا ہوا ہوں۔

جو خود کو جان لیتا ہے، اس سے معاشرے کو فائدہ ملنا شروع ہو جاتا ہے۔ پھر وہ اپنے لیے نہیں جیتا، بلکہ وہ دوسروں کیلئے جیتا ہے۔

حقیقی محبت

بعض لوگ مجازی محبت میں گرفتار ہوتے ہیں، لیکن وہ محبت انھیں نہیں ملتی۔ البتہ اس محبت کی دوری میں وہ خود کو تلاش کر لیتے ہیں۔ خواجہ غلام فریدؒ کو پڑھا جائے یا حضرت داتا گنج بخش کو پڑھا جائے تو پتا چلتا ہے کہ ان لوگوں کی خود شناسی کا سفر عشق مجازی سے شروع ہوا تھا۔ تاریخ میں بے شمار ایسے صوفیا کرام ملتے ہیں جن کا مجاز، حقیقت میں بدل گیا۔ انھوں نے ماسوا سے ماورا کی محبت کر لی۔ وہ ایک سے کل کی محبت پر چلے گئے۔

انسان جب اپنا آپ کسی کو دیتا ہے تو اس کو سمجھ آتا ہے کہ اصل زندگی تو یہ زندگی ہے۔ وہ اپنے آپ کو بیچ دیتا ہے۔ پھر وہ کہتا ہے کہ اب میرا دام انسان نہیں لگا سکتا۔ وہ سمجھتا ہے کہ کسی انسان کیلئے فنا ہونے سے بدرجہا بہتر ہے کہ میں مالک کائنات کیلئے فنا ہو جاؤں۔

بے شمار لوگ ایسے ہیں جنھوں نے خود کو تب جانا کہ جب ان کو نیک لوگوں کی صحبت ملی۔ اس کی بہترین مثال اگر کوئی ہے تو وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا دور نبوت ہے جس کے فیض یافتہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ جب منبر پر بیٹھے تھے تو اپنی داڑھی کو پکڑ کر کہتے تھے کہ میں وہ شخص ہوں جو بکریاں اور اونٹ نہیں چرا سکتا تھا۔ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت تھی جس نے مجھے اس قابل بنایا۔

یہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہما کی جماعت تھی۔ یہ بہ ظاہر عام لوگ تھے جن میں تہذیب کی بھی کمی تھی، تمیز کی بھی کمی تھی اور علم کی بھی کمی تھی، مگر کمال یہ ہوا کہ انھیں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک کی صحبت میسر آ گئی۔ بعض اوقات تاریخ نے کچھ لوگوں کو ایک ایسا آئینہ دیا کہ ان لوگوں نے اپنی شناخت اس کے ذریعے کر لی اور ان کے اندر کی چھپی ہوئی صلاحیتوں کا اظہار ہونے لگا۔ وہ تلوار جو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ لے کر نکلے، وہ تہذیب جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہما لے کر نکل رہے ہیں، وہ سخاوت جو حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ لے کر نکلے اور وہ علم جو حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ لے کر نکلے، اس سے پوری دنیا کو فیض ملا۔ یہ سب اس وجہ سے ممکن ہوا کہ اُن شخصیات کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میسر آئی۔

بہتر شخصیت

کہا جاتا ہے کہ خود شناسی تب بھی ممکن ہوتی ہے اگر اپنے سے بہتر شخصیت مل جائے۔ کیونکہ اپنے سے بہتر کا ساتھ سب سے پہلے یہ خیال پیدا کرتا ہے کہ میں اپنی ذات کی نفی کر رہا ہوں، مجھ سے بہتر بھی کوئی ہے، مجھ میں بہتری کی گنجائش موجود ہے۔ حضرت مولانا رومیؒ فرماتے ہیں کہ ایک شیر کا بچہ گھومتے گھومتے بھیڑوں کے ریوڑ میں چلا گیا اور وہاں پر رہنے لگا۔ ان میں رہتے رہتے اس نے زندگی گزار دی۔ وہ بھول گیا کہ میں شیر ہوں۔ وقت گزرا۔ ایک دن اس نے دیکھا کہ شیروں کا لشکر جا رہا ہے۔ جیسے ہی اس نے شیروں کے لشکر کو دیکھا تو اسے خیال آیا کہ یہ تو مجھ سے ملتے جلتے لگتے ہیں۔ ان کے انداز، ان کے اطوار، ان کا طور طریقہ، ان کے اندر جھلک میری ہے۔ اس نے دیکھا کہ شیر نے ایک دم بھیڑ کو شکار کر لیا اور کھا گیا۔ یہ دیکھ کر اس کے اندر کا شیر جاگ گیا۔ انسان کا اندر تب جاگتا ہے کہ جب وہ اپنے جیسے کو دیکھتا ہے۔ اگر کوئی درندگی کر رہا ہے اور اگر اس کے اندر درندگی ہے تو وہ اس کو اچھا لگے گا۔ جس کے اندر گناہ ہے اور وہ کسی کو گناہ کرتے دیکھے گا تو اسے ترغیب ملے گی۔ اور اگر اندر نیکی ہے تو پھر نیکی کی ترغیب اندر کی سوئی ہوئی نیکی کو جگا دیتی ہے۔

جب حق جاگتا ہے

پرانے وقتوں میں شالامار باغ کے علاقے میں زیادہ تر ہندو اور سکھ لوگ رہا کرتے تھے۔ شام کے کسی پہر میں شالامار باغ میں ایک اللہ کے نیک بندے ٹہل رہے تھے۔ ان کے ساتھ ان کا مرید تھا۔ مغرب کا وقت ہو گیا۔ انھوں نے مرید سے اذان دینے کو کہا۔ مرید نے ادھر ادھر دیکھنے کے بعد کہا کہ اذان کی ضرورت نہیں ہے۔ انھوں نے وجہ پوچھی تو مرید نے جواب دیا کہ میں جدھر دیکھتا ہوں، مجھے سکھوں کی پگڑیاں نظر آتی ہیں یا ہندوؤں کی کلنگ نظر آتی ہیں، اس لیے یہاں پر اذان دینے کی کیا ضرورت ہے۔ اللہ کے ولی نے کہا، بیٹا آپ اذان دے دیجیے۔ جب اذان دی اور پیر و مرید نے نماز شروع کی تو پیچھے تین صفیں بن چکی تھیں۔ مرید نے پوچھا، حضور یہ کیا معاملہ ہے؟ انھوں نے جواب دیا، حق کی بات کرنے سے سویا ہوا حق خود جاگ جاتا ہے۔

ایک کا حق بولنا بہت سوں کے سوئے ہوئے ''حق'' کو جگا دیتا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ ان ایام میں جن لوگوں کی خودی بیدار ہوئی انھیں تاریخ نے سقراط اور ارسطو کہا تو بعض لوگ درویش ہوئے۔ یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جو انسان کے مقصد حیات کو جگا دیتے ہیں کہ جس مقصد کیلئے اللہ تعالیٰ نے انھیں بھیجا ہے۔ ان کی حق کی پکار اندر کے حق کو جگا دیتی ہے۔ اُن کی باتیں اگرچہ عام باتیں ہوتی ہیں، لیکن اپنی ذات کی گہرائی سے نکلنے کے باعث دوسروں کے دلوں میں گھر کر جاتی ہیں۔ بعض اوقات کسی کا گناہ بھی اس کو خودی سے آشنا کر

دیتا ہے، کیونکہ گناہ گار جب توبہ کی طرف جاتا ہے تو سب سے بڑا انعام یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو اسی سے آشنا کردے۔ گناہ گار کے آنسوؤں میں اتنی عاجزی ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے سارے گناہوں کو مٹا دیتا ہے۔

محرومی کا احساس

وہ نیکی جو آپ کو سلا دے، اس سے بہتر وہ غلطی ہے جو جگا دے۔ جاگنے کے بعد گناہ نہیں ہوتا، توبہ ہوسکتی ہے۔ یہ شعور کہ میں بیدار ہوں، میرا خیال کس طرف جارہا ہے، اللہ کا بہت بڑا انعام ہے۔ ہمیشہ انسان کو غم نے، صالح صحبت نے، توبہ نے یا نیک شخص کی صحبت نے بیدار کیا ہے۔ انسان کی محرومی اس کی طاقت بنتی ہے، بشرطیکہ محرومی کا احساس ہوجائے۔ اگر محرومی کا احساس ہی نہ ہو تو محرومی کو دور نہیں کیا جاسکتا۔ کینسر، ہارٹ اٹیک اور ہیپاٹائٹس سی بہت خطرناک بیماریاں ہیں۔ یہ اس لیے خطرناک ہیں، کیونکہ ان کا پتا اس وقت لگتا ہے کہ جب وقت گزر چکا ہوتا ہے۔ لیکن اس سے بھی خطرناک بات یہ ہوتی ہے کہ آدمی کو پتا ہی نہ ہو کہ میں زندگی میں کس طرف جارہا ہوں۔ انسان پر سب سے بڑی رحمت یہ ہے کہ انسان کی آنکھ کھل جائے اور اسے پتا چل جائے کہ وہ کہاں ہے، کہاں جارہا ہے۔ جب اپنی آنکھ خود پر کھلتی ہے تو اپنی غلطیاں، اپنی کوتاہیاں، اپنے اندر کے موسیٰ اور اپنے اندر کے فرعون کا پتا لگ جاتا ہے۔ سب سے زیادہ خطرے والی بات تب ہوتی ہے کہ جب غلطیوں کا پتا نہ لگے۔ آدمی کو یہ شعور اور احساس ہی نہ ہو کہ وہ کیا کررہا ہے اور کس لیے جی رہا ہے۔

اس کا بہترین حل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے دعا کی جائے کہ اے میرے مالک، مجھے میری غلطیوں سے آشنا کردے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ میرے اندر کینسر پلتے رہیں... نفرت کا کینسر، بغض کا کینسر، لالچ اور حرص کا کینسر، خودستائشی کا کینسر وغیرہ وغیرہ۔

انسان دو تاریخیں کبھی نہیں بھولتا۔ ایک اُس کی تاریخ پیدائش (اگر اسے معلوم ہو) اور دوسری جس دن اس کو یہ پتا لگتا ہے کہ مجھے مالک نے کیوں پیدا کیا۔ اگر یہ پتا لگ جائے کہ مجھے کیوں پیدا کیا گیا ہے، میرا یہاں آنے کا کیا مقصد ہے تو پھر سمجھئے کہ خودستائشی کی بجائے خودشناسی کا سفر شروع ہوگیا ہے۔

خودی کا احساس

آج بھی بے شمار نوجوانوں میں خودی کا احساس پایا جاتا ہے۔ یہ وہ نوجوان ہیں جن سے معاشرے کو فائدہ ہورہا ہے۔ آج فلاح وبہبود کے کاموں میں جتنے نوجوان نظر آتے ہیں، پہلے اتنے نہیں ہوتے تھے۔ آج بے شمار تحریکیں نوجوانوں کی وجہ سے چل رہی ہیں۔ کتنے ہی نوجوان پاکستان پر مرمٹنے کیلئے تیار رہتے ہیں۔

ہم یہ گلہ کرتے رہتے ہیں کہ نیکی کا زمانہ نہیں ہے، لیکن یہ حقیقت بھی یاد رکھیے کہ ایک ہی وقت میں دونوں چیزیں موجود ہوتی ہیں۔ نہ کسی دور میں نیکی مری ہے اور نہ کسی دور میں بدی ختم ہوئی ہے۔ اہم سوال یہ ہے کہ ہم کس صف میں کھڑے ہیں۔ ہماری لائن کون سی ہے۔ ہمارے عمل سے کتنے لوگ متاثر ہورہے ہیں۔ اگر واقعی ہمارا اخلوص ہے تو پھر بے شمار لوگوں کو اس سے راستہ مل جائے گا۔ بعض اوقات ہماری نصیحتیں دوسروں کو تبدیل نہیں کرتیں، معاملہ فہمی یا حسن اخلاق تبدیل کردیتا ہے۔ حدیث کا مفہوم ہے کہ ''مومن کے نامہ اعمال میں قیامت کے روز سب سے وزنی شے اس کے حُسن اخلاق ہوں گے۔'' کیونکہ حسن اخلاق سب سے زیادہ متاثر کرنے والی شے ہے، دوسروں کے دلوں کو بدلنے والی چیز ہے۔ (کتاب ''اونچی اُڑان'' سے)

شوق کی تلاش

کوئی نہیں چاہے گا کہ اس کی توانائیاں ضائع ہو جائیں۔ کوئی نہیں چاہتا کہ وہ ناکام ہو جائے۔ کوئی نہیں چاہتا کہ اس کی زندگی بے مقصد ہو اور کوئی نہیں چاہتا کہ اسے کامیابی نہ ملے۔ ہر شخص ناکامی سے بچنے کیلئے غور و فکر کرتا ہے اور یہی غور و فکر اسے سنجیدگی کی طرف لے کر جاتا ہے۔

سنجیدگی کی سب سے پہلی نشانی یہ ہے کہ آدمی یہ دریافت کر لے کہ مجھے اپنی زندگی میں کس طرف جانا ہے، میرے لیے ہدایت کہاں پر ہے۔ اگر یہ احساسات نہ ہوں تو درحقیقت یہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے دوری کی نشانی ہے۔ وہ لوگ جنھیں خیال نہیں آتا، جو سوچ نہیں سکتے، ایسے لوگ صرف قبرستان میں پائے جاتے ہیں۔ زندہ انسان ہمیشہ اپنے آپ میں بہتری لانا چاہتا ہے، وہ اپنے کل کو آج سے بہتر بنانا چاہتا ہے۔

محدود سوچ، محدود شعبے

زندگی کے دو حصے ہیں۔ پہلے حصے میں شعور نہیں ہوتا جبکہ دوسرے حصے میں شعور آتا ہے۔ عام طور پر لوگ شعوری زندگی میں یہ نہیں سوچتے کہ ہمیں اللہ تعالیٰ نے کس کام کیلئے پیدا کیا ہے۔ زیادہ تر کی سوچ یہی ہوتی ہے کہ ڈاکٹر یا انجینئر بن جائیں۔ یہ ذہن میں ہونا چاہیے کہ دنیا میں صرف ڈاکٹر یا انجینئر ہی کے شعبے نہیں ہیں بلکہ اور بھی بہت شعبے ہیں۔ مگر لوگوں کی سوچ اتنی محدود ہے کہ وہ سوچتے ہیں کہ اگر میں ڈاکٹر یا انجینئر نہیں بن سکا تو میں ناکام ہوں۔

اللہ تعالیٰ نے کام کرنے کے لامحدود راستے پیدا فرمائے ہیں، لیکن ان لوگوں کا انتخاب صرف دو راستوں تک محدود ہوتا ہے۔ انھوں نے کبھی سوچا ہی نہیں ہوتا کہ کیا اللہ تعالیٰ نے ہمیں انجینئر بننے کیلئے پیدا کیا ہے؟ انہوں نے کبھی اپنے اندر کے آرٹسٹ کو نہیں دیکھا ہوتا۔ انھوں نے کبھی اپنے اندر کے سائنسداں کو نہیں دیکھا ہوتا۔ انھوں نے کبھی اپنے اندر کے ٹیچر کو نہیں دیکھا ہوتا۔ انھوں نے کبھی یہ نہیں جانچا ہوتا کہ میرے اندر اصل ٹیلنٹ کیا ہے۔

دو چہرے

دنیا میں دو طرح کے لوگ ہیں۔ پہلی طرح کے لوگ وہ ہیں جنھیں صبح جلد اٹھنا عذاب لگتا ہے۔ انھیں اپنے کام سے کوئی محبت نہیں ہوتی۔ ایسے لوگوں کی زندگی میں کوئی چمک نہیں ہوتی۔ ان کی زندگی میں بیزاری ہوتی ہے۔

دوسری طرح کے لوگوں کو اپنے کام سے محبت ہوتی ہے۔ یہ محبت انھیں رات دیر تک جاگنے اور صبح جلد اٹھنے پر مجبور کرتی ہے۔ انھیں تھکاوٹ سے کوئی واقفیت نہیں ہوتی، کیونکہ وہ اپنے جسم سے نہیں بلکہ اپنی روح سے کام کرتے ہیں۔ ایسے لوگ پہلے قسم کے لوگوں سے زیادہ چمک والے، متحرک اور شوق والے ہوتے ہیں۔ ہارورڈ یونیورسٹی کی بیس سالہ تحقیق کے مطابق، اس دنیا میں ستانوے فیصد لوگ وہ کام کر رہے ہوتے ہیں جنھیں اُس کام کیلئے پیدا ہی نہیں کیا گیا ہوتا۔ وہ شوق کے بغیر زندگی گزار رہے ہوتے ہیں۔ ظاہراً تو وہ زندہ ہوتے ہیں، لیکن حقیقتاً مُردہ ہوتے ہیں۔ صرف تین فیصد لوگ وہ کام کرتے ہیں جو اُن کا شوق ہوتا ہے، جو اُن کا Passion ہوتا ہے، جس کیلئے وہ پاگل ہوئے جاتے ہیں۔

انسان کے دو چہرے ہیں۔ ایک چہرہ جو نظر آتا ہے جبکہ دوسرا چہرہ نظر نہیں آتا۔ وہ چہرہ کام کا چہرہ ہوتا ہے اور وہی اصل چہرہ ہوتا ہے، کیونکہ آدمی کی شناخت اس کا کام بناتا ہے۔ زندگی میں شناخت کیلئے سفر کی ضرورت ہوتی ہے اور وہ سفر بقول فائز حسن سیال کے، خود شناسی کا سفر ہوتا ہے جو کبھی ختم نہیں ہوتا۔

زندگی کا سب سے اہم سوال

شوق اللہ تعالیٰ کے دربار کی سوغات ہے۔ اسے کوئی کوئی پہچانتا ہے۔ کسی کسی کو اس کی شناخت ہوتی ہے۔ شوق کا پتا لگ جائے تو شخصیت میں اعتماد پیدا ہوتا ہے۔ پھر انسان کو راستے کی رکاوٹ، رکاوٹ نہیں لگتی۔ جیت اور ہار کی پرواختم ہو جاتی ہے۔ دوسروں کی تنقید کا اثر نہیں رہتا۔ شوق والا معاوضے اور وقت

کی قید سے آزاد ہو جاتا ہے۔ شوق کی مصروفیت میں اردگرد کا احساس ختم ہو جاتا ہے۔ شوق کے راستے پر چلنے والا مقابلہ نہیں کرتا۔ مقابلہ ہمیشہ تب ہوتا ہے کہ جب اپنی صلاحیتوں کا علم نہ ہو۔ شوق کا راستہ عبادت کا راستہ ہے، بلکہ یہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کی طرف جانے کا راستہ ہے۔ جس شخص کو اپنے شوق کا پتا لگ جاتا ہے وہ اپنے کام کو عبادت سمجھتا ہے۔ اس سے بڑا اور کوئی مقام نہیں ہے کہ اپنا کام عبادت لگنے لگے۔ اگر یہ نہیں تو کام عذاب لگتا ہے۔

انسانی زندگی میں سب سے قیمتی سوال یہ ہے کہ میرا شوق کیا ہے؟

یہ اتنا سنجیدہ اور اہم سوال ہے کہ جس کو بھی اس کا جواب مل گیا، پھر اسے خریدا نہیں جاسکتا۔ شوق انسان کو خواب بنانے پر مجبور کر دیتا ہے۔ وہ سکون سے نہیں رہنے دیتا۔ شوق کی آگ سے پکی ہوئی ہانڈی بہت ذائقے دار ہوتی ہے۔ خلیل جبران کہتا ہے کہ وہ روٹی مزیدار نہیں ہوتی جس کے اندر شوق یا محبت نہیں ہوتی۔ ایک خاتون قلم کار برتن بناتی تھی۔ کسی نے اس سے پوچھا کہ تم برتن بناتی ہو۔ اس نے جواب دیا، "نہیں، میں برتن نہیں بناتی، میں تو اپنے آپ کو بناتی ہوں۔" اسی طرح شوق والا اپنے کام کو نہیں دکھاتا بلکہ اپنے کام کے ذریعے اپنے آپ کو دکھاتا ہے۔ وہ شوق کسی کام کا نہیں ہے جس سے کوئی فائدہ حاصل نہ ہو۔ اور اگر شوق اور زمانے کی ضروریات مل جائیں تو یہ بہت خوش قسمتی کی بات ہے۔

کیا آپ زندگی کا لطف اٹھا رہے ہیں؟

جو لوگ اپنے شوق کو دریافت نہیں کرتے، وہ صرف زندگی کا چکر پورا کرتے ہیں۔ انسان کی سب سے بڑی تمنا یہ ہوتی ہے کہ وہ سدا زندہ رہے۔ جینئس انسان وہ ہوتا ہے جو اپنے وقت اور کام کی سرمایہ کاری اس انداز سے کرے کہ اس کے جانے کے بعد بھی انسانیت اس سے استفادہ کرتی رہے۔ شوق سے کیا گیا کام آدمی کو امر کر دیتا ہے۔

زندگی میں مزہ پیدا کرنے کیلئے اپنا شوق دریافت کیجیے، کیونکہ بغیر شوق کے زندگی کا کوئی مزہ نہیں آئے گا۔ پینسٹھ سال کی زندگی میں انسان نوے ہزار گھنٹے کام کرتا ہے۔ اس کے دو ہی طریقے ہیں۔ ایک یہ کہ ان نوے ہزار گھنٹوں کو رو کر گزارہ جائے یا پھر انھیں اپنے شوق کی تکمیل کیلئے استعمال کر لیا جائے۔

حضرت علامہ اقبال فرماتے ہیں کہ "اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغِ زندگی ۔۔۔" ہماری زندگی کا راز ہمارے ہی اندر ہے۔ جب تک اس اندر کو تلاش نہیں کیا جائے گا، تب تک قرار نہیں آئے گا۔

چھوٹے انسان کی تقدیر دوسروں کے ہاتھوں پر لکھی ہوتی ہے جبکہ بڑے انسان کے ہاتھ پر زمانے کی تقدیر لکھی ہوتی ہے۔ حضرت قائداعظم محمد علی جناح کی وجہ سے کتنے ہی انسانوں کی زندگی بدل گئی، کیونکہ ان کے ہاتھ پر زمانے کی تقدیر لکھی ہوئی تھی۔ جبکہ تمام جہانوں کی تقدیر ہمارے آقا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر لکھی ہوئی ہے، یعنی آپ صلی اللہ علیہ وسلم جہانوں کیلئے رحمت ہیں۔ (زیرِ طبع کتاب "سوچ کا ہمالیہ" سے)

آپ کے اندر کا خزانہ

ہر شخص کے اندر ایک خزانہ ہوتا ہے اور وہ خزانہ شوق اور دلچسپی کا خزانہ ہے۔ انسان کی دلچسپی جس چیز میں دلچسپی ہوتی ہے، وہ خواہ کچھ ہی ہو، اس کے پاس اس چیز کے متعلق ویسی معلومات، ویسی کتابیں، ویسی مجالس، ویسے دوست، ویسا ماحول اور ویسے ہیروز مل جاتے ہیں۔ چونکہ دلچسپی اور شوق مختلف ہوتے ہیں، اس لیے ہر شخص کے ہیرو مختلف ہوتے ہیں۔ جو لیڈر ہوگا اس کیلئے محمد علی جناح ہیرو ہوں گے، جبکہ جو مفکر ہوگا اس کیلئے حضرت علامہ محمد اقبالؒ ہیرو ہوں گے۔

انسان کا دوسروں سے متاثر ہونا اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے۔ انسان واحد مخلوق ہے جو انسپائر ہوتی ہے۔ دوسری کوئی مخلوق کسی سے انسپائر نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر انسپائریشن کا مادہ رکھا ہے اور اس خاصیت کی وجہ سے وہ اپنا شوق تلاش کرتا ہے۔ جس طرح ہر شخص اپنے جاننے والے کو پہچان لیتا ہے، اسی طرح جب اندر کے شوق کے متعلق چیزیں سامنے آتی ہیں تو وہ انھیں پہچان لیتا ہے، کیوں کہ وہ اپنے اندر سے اسے جانتا ہے۔

اس سے بڑا جرم شاید اور کوئی نہیں کہ ایک شخص اپنی زندگی شوق کے بغیر گزار دے۔ شوق کے بغیر زندگی ایسے ہی ہے جیسے کانٹوں پر سونا اور تلواروں پر چلنا۔ اگر شوق سلامت ہو تو انسان کو رکاوٹ روک نہیں سکتی۔ حضرت سلطان باہوؒ فرماتے ہیں، ''ایمان سلامت ہر کوئی منگے۔۔۔ شوق سلامت کوئی ہو''۔

(زیر طبع کتاب ''سوچ کا ہمالیہ'' سے)

صحیح سمت کا انتخاب

انسان روح اور جسم کا مجموعہ ہے۔ جس طرح انسان اپنے جسم کو بہتر بناتا ہے، اسی طرح روح کو بھی بہتر بنانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ جب یہ دونوں بہتر ہوں تو سمت درست ہوتی ہے۔ انسان کے چھوٹے سے چھوٹے عمل کے پیچھے کوئی نہ کوئی محرک ہوتا ہے۔ دیکھنا یہ ہوتا ہے کہ وہ محرک ذہن ہے یا کوئی اور چیز ہے۔ مثال کے طور پر، جسم کو کرنٹ لگے تو بغیر کسی سوچ کے ہاتھ فوری طور پر پیچھے کی جانب حرکت کرتا ہے۔ ہمیں یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ آخر کون سی ایسی چیز ہے جو سوچنے سے پہلے یہ فیصلہ کراتی ہے کہ ہاتھ پیچھے کرنا ہے۔

نفس اور ذہن

بعض معاملات کے پیچھے ذہن ہوتا ہے، جبکہ بعض معاملات ایسے ہوتے ہیں جن کے پیچھے نفس ہوتا ہے۔ جیسے ضرورت سے زیادہ چاہنا۔ یہ کام نفس لوامہ کا کام ہے۔ نفس لوامہ کی وجہ سے جبلت جانوروں جیسی ہو جاتی ہے۔ بعض کاموں کے بعد شرمندگی کا احساس ہوتا ہے۔ یہ کام نفس عمارہ کراتا ہے۔ یہی نفس عمارہ پشیمانی بھی دیتا ہے اور ندامت بھی۔

بعض اوقات انسان چاہتا ہے کہ میں دوسروں کی مدد کروں، دوسروں پر روپیہ پیسہ نثار کروں، دوسروں کی خاطر اپنا وقت استعمال کروں، میری توانیاں دوسروں کیلئے استعمال ہوں، میری وجہ سے کسی کا بھلا ہو۔ یہ کام نفس مطمئنہ کراتا ہے۔ نفسِ مطمئنہ انسان کو ہر حال میں مطمئن رہنے کو کہتا ہے۔

ہائی جیکر

انسان کے اندر بہت سارے ہائی جیکرز ہوتے ہیں اور وہ ہائی جیکرز اس کی سمت متعین کرتے ہیں۔ ایک طیارہ فضا میں پرواز کرتا ہے۔ اچانک ایک ہائی جیکر اٹھتا ہے، ہتھیار نکالتا ہے، پائلٹ کے پاس جاتا ہے اور کہتا ہے کہ جہاں میں چاہتا ہوں، جہاز کو وہیں لے کر جاؤ۔ مسافروں کو کہہ دیا جاتا ہے کہ اگر کسی نے ہلنے کی کوشش کی تو جہاز تباہ کر دیا جائے گا۔ اس کے بعد آواز آتی ہے کہ طیارہ اغوا ہو گیا۔ جس طرح ایک ہائی جیکر طیارہ اغوا کرتا ہے، اسی طرح انسان صحیح چل رہا ہوتا ہے کہ اچانک اس کے اندر سے ایک ہائی جیکر اٹھتا ہے جسے نفس لوامہ کہا جاتا ہے، وہ اسے اغوا کر لیتا ہے۔ اسے غصہ آتا ہے۔ وہ فیصلہ کرتا ہے اور سامنے کھڑے شخص کو قتل کر دیتا ہے۔ یوں زندگی کا طیارہ کریش ہو جاتا ہے۔ یہ اس وجہ سے ہوتا ہے کہ انسان نے اپنے اس ہائی جیکر کو کنٹرول نہیں کیا ہوتا۔ ہر انسان چاہتا ہے کہ اس کی سمت درست ہو، وہ کامیاب ہو، لیکن اس سے پہلے ہائی جیکر کو کنٹرول کرنا بہت ضروری ہے۔

انسان کی زندگی میں کئی طرح کے ہائی جیکرز ہوتے ہیں۔ ان میں لالچ ایک اہم ہائی جیکر ہے۔ لالچ ہمیشہ اس شخص میں ہوتا ہے جو اپنے آپ کو غیر محفوظ سمجھتا ہے۔ اپنے آپ کو غیر محفوظ سمجھنا یا تو اپنی غلطیوں کی وجہ سے ہوتا ہے یا پھر اس کی وجہ معاشرہ بنتا ہے۔ اپنے آپ کو غیر محفوظ سمجھنے کا ایک محرک کرپشن ہے۔ کبھی اس بات پر غور نہیں کیا گیا۔ یہ کیوں ہے؟ ہم سمجھتے ہیں کہ شاید اس موضوع پر سیمینار کرنے سے یہ ختم ہو جائے گی۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے کہ پانی کے لیک ہونے کی جگہ تلاش کر لی جائے، لیکن پیوند کسی دوسری جگہ لگا یا جائے۔ جس معاشرے میں کرپشن کم ہوتی ہے، وہاں پر لوگ اپنے آپ کو زیادہ محفوظ سمجھتے ہیں۔ انھیں پتا ہوتا ہے کہ کچھ ہو بھی جائے تو حکومت ہمارے بچوں کو سنبھالے گی، کیونکہ یہ اس کی ذمے داری ہے۔

غیر محفوظ کو محفوظ بنانے کے دو طریقے ہیں۔ ایک یہ کہ محنت کر کے ساری چیزیں جیسے گھر، گاڑی اور آسانیاں لائی جائیں کیونکہ جب آسانیاں آتی ہیں تو آدمی اپنے آپ کو محفوظ سمجھنا شروع کر دیتا ہے۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ اپنے اندر توکل پیدا کیا جائے اور ہر حال میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا جائے، کیونکہ جب توکل اور شکر ہوتا ہے تب بھی آدمی اپنے آپ کو محفوظ سمجھتا ہے۔ پہلا طریقہ تو تقریباً ناممکن ہے، دوسرا طریقہ بہت آسان اور عملی ہے۔

عادات کا ہائی جیکر

زندگی کا ایک بہت بڑا ہائی جیکر ہماری عادات ہیں۔ زیادہ تر عادات لاشعوری طور پر بنتی ہیں، لیکن جب شعور آتا ہے تو ہمیں یہ انتخاب (چوائس) مل جاتا ہے کہ کس عادت کو اختیار کیا جائے۔ بعض لوگوں کی شخصیت تو بہت شان دار ہوتی ہے، لیکن عادات ٹھیک نہیں ہوتیں۔ بعض کے والدین کا بہت نام ہوتا ہے، لیکن اولاد میں وہ عادتیں نہیں ہوتیں۔ بعض خود بہت اچھے ہوتے ہیں، لیکن ان کا برتاؤ ملازموں کے ساتھ اچھا نہیں ہوتا۔ بعض عادتیں نسلوں چلتی رہتی ہیں۔ بعض پر اللہ تعالیٰ کا کرم ہوتا ہے کہ ان کی عادات بادشاہوں والی ہوجاتی ہیں۔ عادات یا تو انسان کو بنادیتی ہیں یا تباہ کردیتی ہیں۔ انسان پہلے عادات بناتا ہے پھر وہی عادات انسان کو بناتی ہیں۔

جذبات کی ہائی جیکنگ

انسان کی زندگی میں جذبات بھی بہت بڑا ہائی جیکر ہوتا ہے۔ بعض اوقات انسان اپنے جذبات کا اظہار وقت پر نہیں کرتا۔ پھر ایک عمر گزر جانے کے بعد اس کا اظہار کرتا ہے، لیکن اس وقت سوائے عزت کو خاک میں ملانے میں کے اور کچھ نہیں ملتا۔ جیسے بعض لوگوں کے پاس روپیہ، پیسہ، عزت، شہرت سب کچھ ہوتا ہے لیکن عمر کے آخری حصے میں جذبات میں آکر شادی کرلیتے ہیں یا میاں بیوی میں علیحدگی ہوجاتی ہے۔ اچھا بھلا گھر برباد ہوجاتا ہے اور یوں وہ اپنے جذبات کے ہاتھوں اپنی عزت گنوادیتے ہیں۔

اپنی سمت درست رکھنے کیلئے اپنے ہائی جیکروں کو کنٹرول کرنے کی کوشش کیجیے۔

کتاب زندگی بدل دیتی ہے

کتابیں آدمی کی سمت بدل دیتی ہیں۔ بعض اوقات کتاب کا احترام اتنا ہوتا ہے کہ فیض ملنا شروع ہوجاتا ہے، جیسے بعض اوقات ہم قرآن مجید پڑھتے ہیں تو آنکھوں سے آنسو جاری ہوجاتے ہیں اور اس تقدس واحترام کی وجہ سے زندگی میں ہدایت آجاتی ہے۔ اسی طرح سچی طلب، تلاش، محبت اور ادب سمت بدل دیتی ہیں۔ حضرت بابا فرید گنج شکرؒ نے اپنی زندگی میں بہت کم روٹی کھائی۔ کسی نے پوچھا کہ آپ اتنا کم کیوں کھاتے ہیں تو انھوں نے جواب دیا کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اتنی مقدار میں گندم کھائی تھی تو میری کیا مجال کہ میں اس مقدار سے زیادہ گندم کھاؤں۔ یہ ادب کی انتہا ہے۔

اچھے اور برے ساتھی

جب اللہ تعالیٰ کا کرم ہوتا ہے تو بندے کی زندگی میں اچھے لوگ آنا شروع ہوجاتے ہیں اور وہ اس کی سوچ کو مثبت کردیتے ہیں۔ پھر اس مثبت سوچ سے اس کے ذریعے دوسروں کو اچھائی ملنا شروع ہوجاتی ہے۔ لالچی انسان کے پاس لالچ اتنا ہوتا ہے کہ وہ اپنے ساتھ والے لوگوں کو لالچی بنادیتا ہے۔ اس کے برعکس سخی انسان دوسروں کو اپنی اچھی عادات منتقل کرتا ہے۔ وہ خاموشی سے نصیحت کرتا ہے۔ خاموشی سے نصیحت کا مطلب یہ ہے کہ اس کا برتاؤ اتنا اچھا ہوتا ہے کہ اس کے ساتھ والے لوگ بھی اچھے ہوجاتے ہیں۔

بعض لوگوں کے ملنے سے اندر کی کمینگی جاگ جاتی ہے جبکہ بعض لوگوں کے ملنے سے اندر کی روحانیت جاگ جاتی ہے۔ بعض لوگوں کے ملنے سے حیا آجاتی ہے۔ حضرت واصف علی واصفؒ فرماتے ہیں، ''ایک شخص اچھی زندگی نہیں گزار رہا تھا۔ ایک دم نیک ہوگیا۔ کسی نے پوچھا، یہ اچانک کیا ہوا؟ اس نے جواب دیا، میری زندگی میں پیر صاحب آگئے ہیں۔ اس نے کہا، کون سے پیر صاحب ہمیں بھی ان سے ملاؤ۔ اس نے جواب دیا، میرے پیر صاحب میری بیٹی ہے۔'' حضرت واصف علی واصفؒ فرماتے ہیں، ''اچھے لوگوں کی زندگی میں موجودگی اچھے مستقبل کی ضمانت ہے۔'' جب تک اپنے علم اور ادب کو اللہ تعالیٰ کا

فضل کہیں گے، یہ قائم رہے گا لیکن جب یہ سمجھیں گے کہ یہ میرا کمال ہے تو پھر ناکامی شروع ہو جائے گی۔

درست ترین سمت

ہمارے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سب سے بڑے رول ماڈل ہیں۔ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے پہلے اپنوں کو اکٹھا کر کے دعوت دی اور کہا کہ اگر میں کہوں کہ پہاڑ کے پیچھے دشمن کا لشکر ہے تو جواب میں انھوں نے کہا، ہماری جانیں آپؐ پر نثار، آپؐ سچے ہیں، صادق وامین ہیں۔ ان میں ایک شخص جس کا نام عمر بن ہشام (ابوجہل) تھا، اٹھا اور چل پڑا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے آواز دی اور کہا کہ کیا آپ اس بات کو نہیں مانیں گے؟ اس نے کہا، میں تلوار لینے جا رہا ہوں، مجھے آپؐ پر اتنا یقین ہے کہ اگر اس پہاڑ کے پیچھے لشکر ہے تو تلوار لاتا ہوں اور اس لشکر والوں کی گردنیں اڑا دوں گا۔ مجھے تحقیق کی ضرورت نہیں ہے۔ پھر اگلی بات حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمائی کہ اگر میں ''لا الہ الا اللہ'' قبول کرنے کا کہوں تو؟ اس پر ابوجہل نے کہا کہ میرے باپ داداؤں کا جو دین ہے، وہ یہ نہیں ہے۔ میں ایک خدا کو نہیں مان سکتا۔

لیکن اسی محفل میں ایک نو سال کا بچہ (حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ) کھڑا ہوتا ہے اور کہتا ہے کہ میں مانوں گا۔ اس کے بعد ایک دوست (حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ) کھڑا ہوتا ہے اور کہتا ہے، میں مانوں گا۔ گھر کے اور چند لوگ یہ دعوت تسلیم کرتے ہیں۔ عظمت کی انتہا یہ ہے کہ آپ کے اپنے گھر والے آپ کو مانیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہمارے لیے کسی بھی لحاظ سے درست ترین سمت فراہم کرتی ہے۔

''کاش'' سے پہلے

اپنی زندگی کو سمت دیجیے، کیونکہ یہ ایک بار ملی ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا انعام ہے۔ یہ قدرت کا عطیہ ہے۔ جو ایک بار آ گیا، پھر نہیں آئے گا۔ انھیں لوگوں کا نام زندہ رہے گا جو اچھے کام کریں گے اس لیے دلوں میں زندہ رہنے والے کام کیجیے۔ اپنے اندر سوال پیدا کیجیے کہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے آیا ہوں، کیا میں اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق زندگی گزار رہا ہوں؟ اگر یہ سوال دل میں آ گیا تو پھر یہ زندگی، زندگی نہیں رہے گی، عبادت بن جائے گی۔ لیکن اگر یہ سوال نہیں ہوگا تو پھر گھڑیاں گزریں گی، دن گزریں گے، ہفتے گزریں گے، مہینے گزریں گے اور زندگی بھی گزر جائے گی۔

آخر میں صرف ایک چیز ہوگی۔۔۔ کاش!

اللہ تعالیٰ ہمیں اس کاش اور افسوس سے بچائے۔ آمین

(زیر طبع کتاب ''سوچ کا ہمالیہ'' سے)

ممتاز بننے کا جذبہ

انسان تین چیزوں سے منفرد ہوتا ہے۔ ایک پیشہ، دوسرا جذبہ اور تیسرا کام۔ دنیا کی تاریخ میں آج تک جتنے بھی لوگ ممتاز ہوئے ہیں، ان کا تعلق خواہ کسی بھی شعبے سے ہو، ان کی مثالیں دی جاتی ہیں۔ اس کا مطلب ہے کہ ان کے کام نے انھیں ممتاز کیا۔ بہترین پیشہ ہو، بہترین جذبہ ہو لیکن اگر کچھ کر کے نہیں دکھایا تو پھر ممتاز نہیں ہوا جا سکتا۔ وہ تمام کے تمام لوگ جو کچھ کر کے چلے گئے، دراصل ان کا جذبہ ان کے کام کے ذریعے نظر آتا ہے۔

یاد رکھیے، آدمی کو اس کا کام زندہ رکھتا ہے۔ کاؤنسلنگ اور کوچنگ میں جب کسی شخص کو پرکھا جاتا ہے تو اس کی قوت ارادی کو دیکھا جاتا ہے کہ وہ ایک سے دس میں سے کون سے نمبر پر ہے۔ اگر وہ پانچ سے کم ہے تو اس کا مطلب ہے کہ اس شخص کے اندر وہ جنون نہیں ہے جو اسے مستقبل بنانے پر مجبور کرے، لیکن اگر نمبر پانچ سے اوپر ہے تو پھر اس کا مطلب ہے کہ اس کے اندر اتنا جنون موجود ہے کہ جو اس کے مستقبل پر اثر انداز ہو سکتا ہے۔

غلط موازنہ

ایک عام شخص کا دوسرے عام شخص سے موازنہ ہو سکتا ہے، لیکن پہاڑ اور ذرے کا موزانہ نہیں ہو سکتا۔ دنیا کے تمام ولی، پیغمبر، رسول ہم ان کے قدموں کی خاک بھی نہیں بن سکتے۔ وہ بہت بڑی ہستیاں ہیں۔ ہمیں دنیا گزارنے کیلئے روٹی بھی کمانی پڑتی ہے، نوکری بھی کرنی پڑتی ہے، ہمیں شاباشی کی بھی ضرورت ہے، ہمیں گاڑی کی بھی ضرورت ہے، ہمیں اچھے کپڑوں کی بھی ضرورت ہے۔ ان تمام چیزوں کے علاوہ ہمیں تھوڑا سا ممتاز ہونے کی تمنا بھی ہوتی ہے۔ اگر یہ تمنا غیر انسانی ہے تو پھر انسان کے درمیان مقابلہ بازی نہ رہے۔ انسان مقابلہ بازی کی حس کو خون سے نہیں نکال سکتا، کیونکہ یہ صلاحیت انسان کے اندر بدرجہ اتم موجود ہے۔

اگر آپ دنیا میں ممتاز ہونا چاہتے ہیں تو آپ کو پیشے، جذبے اور عمل پر کام کرنا پڑے گا۔ اگر آپ یہ تین قدم اٹھا لیتے ہیں تو نتیجہ آنے لگے گا۔ سات آٹھ سو سال پہلے لکھی گئی کتاب ''کیمیائے سعادت'' جو انسانی نفسیات اور فلسفے پر سند کی حیثیت رکھتی ہے، حضرت امام غزالیؒ کو زندہ رکھنے کیلئے کافی ہے۔ آزادی کی تحریک میں مسلمانوں کے قائدین میں سب سے نمایاں نام حضرت قائداعظم محمد علی جناحؒ کا ہے، کیونکہ ان کے جذبہ اور کام نے کر کے دکھایا۔ اس کے علاوہ انسانی تاریخ میں جتنے بھی ممتاز اور نمایاں نام ہیں، وہ سب اسی فارمولے پر ممتاز ہوئے۔

پیشے کے حوالے سے دنیا کی رائے مختلف ہے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ پیشے کے انتخاب کی بنیاد زمانے کے ٹرینڈ پر ہوتی ہے جیسے پرانے زمانے جو قالین بنتے تھے، آج ان کا کاروبار کیا جائے تو وہ نہیں چلے گا۔ وہ قالین سجانے کیلئے تو چل جائیں گے، لیکن استعمال کیلئے نہیں چلیں گے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آج کے زمانے کے قالین کا معیار بدل چکا ہے۔ اسی طرح آج اگر کسی چیز تشہیر ڈھول سے کی جائے تو وہ بہت سست ہوگی۔ تیز تر تشہیر کیلئے جدید طریقہ کار سوشل میڈیا کو اپنا یا جائے گا۔ ٹیکنالوجی میں ترقی کے باعث دنیا میں جتنی چیزوں کا معیار بہتر ہوئے، ان میں نئے پروفیشن بھی آئے اور ان کی شکلیں بھی بدلیں۔ آج ہمیں دیکھنا ہے کہ آج کے زمانے کے مطابق ہمارے لیے سب سے زیادہ فائدہ مند اور اچھا کیا ہے۔

ہر خواہش پوری نہیں ہوتی

دنیا میں کوئی خواہش سو فیصد پوری بھی ہو جائے، تب بھی انسان مطمئن نہیں ہوتا۔ جو لوگ گاڑی لینا چاہتے ہیں، وہ گاڑی لے کر بھی خوش نہیں ہوتے۔ لوگ جس نوکری کیلئے بے تاب ہوتے ہیں، وہ انھیں مل جائے، تب بھی خوش نہیں ہوتے۔ انسان سو فیصد مطمئن نہیں ہو سکتا۔ اسے اطمینان کسی کل نہیں ہوتا۔

ہم موٹیویشن بڑے ناموں سے لیتے ہیں۔ کبھی کسی عام آدمی سے موٹیویشن نہیں مل سکتی۔ ہم میں تھوڑی سی یہ گنجائش ضرور ہونی چاہیے کہ ہم جس پیشے میں ہیں، ممکن ہے وہ پیشہ ٹھیک نہ ہو۔ انسان کے ساتھ سب سے بڑا دھوکا یہ ہوتا ہے کہ اگر انسان کا گزارا ہو رہا ہو تو وہ نیا نہیں سوچتا۔ جب تک اندر چبھن نہ ہو، آدمی اپنی سیٹ نہیں چھوڑتا۔ جب تک تکلیف نہ ہو، کچھ نیا نہیں کرتا۔ ہمیں کبھی تو رک کر سوچنا چاہیے کہ اگر ہمیں ممتاز بننا ہے تو پھر کلرکوں کی فوج سے تو ممتاز

نہیں بنا جاسکتا، چھوٹے موٹے کام سے ممتاز نہیں ہوا جاسکتا۔ کوئی تو کام ایسا ہونا چاہیے جس سے ممتاز بنا جائے۔

اس حوالے سے تھوڑا غور وخوض ضرور کیا جائے کہ ہم کون سے کام کر سکتے ہیں۔ وہ ایک یا دو یا تین کام ہو سکتے ہیں۔ ان کاموں کیلئے عمر اور وقت کی کوئی قید نہیں ہے۔ زندگی میں کسی بھی وقت فیصلہ ہوسکتا ہے کہ مجھے ممتاز بننا ہے۔ لیکن اگر کچھ نیا کرنے کا حوصلہ ہی نہ ہو تو پھر جو پیشہ اختیار کیا ہوتا ہے، آدمی اسی پر تکیہ کیے رہتا ہے۔ اس لیے جو نئی کوشش نہیں کرسکتا وہ ممتاز نہیں ہوسکتا، کیونکہ یہ بذات خود بہت بڑی قیمت ہے۔ زندگی کو کبھی کبھی بہت سنجیدگی کے ساتھ لینا چاہیے، لیکن زندگی میں کبھی کبھی کچھ نیا بھی کرنا چاہیے۔ اگر زندگی کو تھوڑا سا ڈرامائی بنا دیا جائے تو کیا حرج ہے؟ اگر ہماری دو سال کی کوشش کی قیمت سے باقی پچیس تیس سال کی زندگی بہتر ہو جائے تو برا سودا نہیں ہے۔ لیکن اگر ہم اسی ڈگر پر چلتے رہیں تو زندگی تو مکمل ہو جائے گی، لیکن وہ ممتاز نہیں بن سکے گی۔

انسان کا امتیاز

دنیا کی کوئی دوسری مخلوق آج تک نام ور نہیں ہو سکی۔ اگر کوئی ہو گا بھی تو وہ کسی انسانی واقعے سے منسلک ہو گا، جیسے اصحاب کہف کا کتا۔ ناموری فقط اگر ملی ہے تو انسان کو ملی ہے۔ انسان مرنا نہیں چاہتا۔ وہ فہم کے اس درجے پر چلا جاتا ہے کہ اسے سمجھ آجاتا ہے کہ مجھے مرنا تو ہے، اس دنیا سے جانا تو ہے۔ لیکن اگر کوئی کام ایسا کر جاؤں تو پھر امر ہو جاؤں گا۔ یہ سمجھ کہ میں کچھ کر جاؤں گا تو زندۂ جاوید ہو جاؤں گا، صرف اور صرف انسان کو ملی ہے۔ ''بلھے شاہ، اسی مرنا ناہی گور پیا کوئی ہور'' یہ انسانی جملہ ہے۔ یہ کسی اور مخلوق نے نہیں کہا، یہ فقط انسان نے کہا ہے۔ اس لیے ہمیں سوچنا چاہیے کہ آخر ایسا کون سا کام ہے جو ہمیں معتبر کرسکتا ہے۔ پھر آج سے کوئی کام ایسا نہیں کرنا جس کا نتیجہ معتبر ہونے کے سوا ہو۔ کوئی سوچ ایسی نہیں سوچنی جس کا ہدف معتبر ہونے کے سوا ہو۔ جب مرنا ہی ہے تو پھر کچھ کر کے کیوں نہ مرا جائے۔ جب کچھ کر کے مرنا ہے تو پھر وہ کام کیا جائے جو نمایاں کرے۔

بغیر کام کے نام بنانا زیادتی ہے، بلکہ نام بنتا ہی نہیں ہے۔ قدرت کا قانون یہ ہے کہ قدرت کبھی بھی بغیر کام والے کا نام نہیں بناتی۔ وہ کہتی ہے کہ جس نے بھی کچھ کیا ہے، خواہ اس کا تعلق دنیا کے کسی بھی قوم، خطے یا مذہب سے ہو، اسے شناخت ملے گی۔ انسان خوف کی وجہ سے کچھ نیا نہیں کرتا، لیکن یہ بھی یاد رہے کہ خوف سے نجات میں ہی کامیابی ہے۔ یہ وہ پہلا تالہ ہے جسے کھولنا ضروری ہے۔ ایک لاکھ روٹیاں پڑی ہوں، لیکن ایک وقت دو ہی کھائی جاسکتی ہیں، ستر سوٹ ہوں، ایک وقت میں ایک ہی پہنا جائے گا۔ پچاس گاڑیاں ہوں، سواری ایک میں ہوسکتی ہے۔ زندگی محدود ہے۔ اس محدود زندگی میں ہمیں بہت سی چیزیں نہیں چاہئیں۔ صرف کچھ محدود اچھی کوالٹی کی چیزیں چاہئیں جس سے زندگی اچھی گزر جائے۔ لیکن جو بھی کیا جائے، اس معیار اور انداز سے کہ وہ ممتاز کردے۔ اگر چیزوں سے نام بننا ہوتا تو حضرت قائد اعظم محمد علی جناحؒ جاتے ہوئے اپنا سب کچھ پاکستان کے نام پر کر کے نہ جاتے۔ سب سے بڑا ذہین وہ ہے جسے یہ سمجھ آگیا ہو۔ لالچ بہت بڑا دشمن ہے، اس لیے امتیاز کا پہلا ٹیسٹ لالچ سے شروع ہوتا ہے۔

پیسہ خوشی نہیں دیتا

ایک حد کے بعد پیسہ صرف ہندسوں میں نظر آتا ہے، جیب میں نظر نہیں آسکتا۔ ایسے لوگ جن کے پاس اتنا پیسہ ہے کہ وہ ہندسوں میں چلا گیا ہے۔ اگر ان کا انٹرویو لیا جائے اور ان سے پوچھا جائے کہ انھیں خوش کرنے والی چیز کیا ہے تو جواب ملے گا، بینک اسٹیٹمنٹ۔ پھر پوچھا جائے کہ اس کے بعد کوئی چیز جس سے آپ کو خوشی ملتی ہو تو جواب ملتا ہے کہ کوئی ایسا کام جو خوشی کا باعث بن سکے۔ گویا، کام خوشی دیتا ہے اور وہی کامیاب کرتا ہے۔ قدرت نے اتنا بڑا کارخانہ چلانا ہے، اس لیے اسے سارے لوگ ڈاکٹرز نہیں چاہئیں، سارے انجینئرز نہیں چاہئیں، سارے ٹریڈرز نہیں چاہئیں، سارے لیڈرز نہیں چاہئیں، سارے سیاستداں نہیں چاہئیں۔ اس لیے کائنات میں ورائٹی ہے۔ قدرت کے پاس ایک ڈائی نہیں ہے کہ جس سے ایک جیسے ہی انسان بنتے جائیں۔

انسان فطرت، طبیعت، مزاج، سوچ، عادات، نمو، اندازوں اور حالات کے لحاظ سے ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔ یہ سب چیزیں انسان کو ایک دوسرے سے جدا کرتی ہیں۔ ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ اس فہرست میں کون سی ایسی چیز ہے جو ہمیں دوسروں سے ممتاز کرتی ہے۔ پروفیشن چھوٹے سے چھوٹا ہی

کیوں نہ ہو، لیکن اس پروفیشن سے محبت کا ہونا بہت ضروری ہے۔ ایک تحقیق کے مطابق جو بندہ چھوٹے سے چھوٹا کام بھی بہترین کرسکتا ہے، اللہ تعالیٰ اسے شناخت دے دیتا ہے۔ ہم شناخت والی مخلوق ہیں۔ ہم ایک جیسے شیر نہیں ہیں، ایک جیسے گیدڑ نہیں ہیں، ایک جیسے شاہین نہیں ہیں۔ ہم ممتاز ہیں۔ ہم میں سے ہر کوئی ایک دوسرے سے جدا جدا ہے۔

ماں اپنا پورا ضرور بھی لگا لے تو اس کے چھ بچے ایک جیسے نہیں ہو سکتے۔ باپ پورا زور لگا لے تو چھ بچے ایک جیسے نہیں ہو سکتے۔ ایک تحقیق کے مطابق، پہلے یا آخری بچے میں خود اعتمادی کا امکان زیادہ ہوتا ہے، کیونکہ پہلے بچے کے ناز نخرے بہت زیادہ اٹھائے جاتے ہیں جس سے اس کی شخصیت میں اعتماد پیدا ہوتا ہے جبکہ آخری بچے کے وقت معاشی حالات اتنے اچھے ہو چکے ہوتے ہیں کہ جس کی وجہ سے خود اعتمادی آجاتی ہے۔

ہمیں وہ کام تلاش کرنا ہے جس سے ہمیں عشق ہے۔ دنیا میں کسی بھی شعبے کے جتنے بھی نام ہیں، انھوں نے ایک کام پکڑا، پھر اسے پالش کیا ہے۔ اس وجہ سے وہ کام ان کی شناخت بنا۔ یونانیوں اور چینیوں کا پینٹنگ بنانے کا مقابلہ ہوا۔ دونوں کو ایک میدان میں لے جایا گیا۔ درمیان میں پردہ لگا دیا گیا تاکہ ایک دوسرے کو دیکھ نہ سکیں۔ جب پینٹنگ بن گئی تو پردہ ہٹایا گیا۔ دیکھا کہ یونانیوں نے شان دار پینٹنگ بنا دی لیکن جب چینیوں کی طرف دیکھا گیا تو بالکل اسی طرح کی پینٹنگ ان کی طرف بھی بنی ہوئی تھی۔ دیکھنے والے حیران رہ گئے کہ ایسا کیسے ممکن ہے۔ پتا لگایا گیا کہ ایسا کیسے ممکن ہے تو معلوم ہوا چینیوں نے دیوار کو شیشہ بنا دیا تھا جس پر اس پینٹنگ کا عکس پڑ رہا تھا۔ چلو ہم پینٹر نہ بنیں، آئینہ ہی بن جائیں۔

فروخت کی صلاحیت

جو شخص کوئی شے بیچ سکتا ہے تو وہ بہت بڑا گرو ہے، کیونکہ اس کے پاس بیچنے کی صلاحیت ہے۔ جو آدمی اپنے آپ کو بیچ سکتا ہے، اپنے آپ کو برانڈ کرسکتا ہے، اپنے آپ کو پروڈکٹ بنا سکتا ہے، اپنی سروس پیش کرسکتا ہے، وہ بھوکا نہیں بیٹھ سکتا، کیونکہ دنیا میں کام زندہ کرتا ہے اور اگر آپ نے کام تلاش کرلیا ہے تو پھر وہ آپ کو شناخت ضرور دے گا۔

انسانوں کیلئے فائدہ رساں

کسی کی صحبت موڈ اچھا کردیتی ہے۔ سوچ موڈ اچھا کردیتی ہے، خیال موڈ اچھا کردیتا ہے۔ اگر آپ کو دل سے عزت کرنا آتی ہے تو آپ اس سے بھی ممتاز بن سکتے ہیں۔ ہر کام کو خلوص کے ساتھ بہترین کرنے کی کوشش کیجیے، کیونکہ یہی خلوص آپ کو اس کام کی طرف لے جائے گا جس کام کیلئے آپ کو قدرت نے پیدا کیا ہے۔ قدرت اس شخص پر رحم کرتی ہے جو چھوٹے چھوٹے کام بھی بڑی نفاست کے ساتھ کرتا ہے۔ حدیث شریف کا مفہوم ہے کہ "تم میں سے بہترین انسان وہ ہے جو انسانوں کیلئے فائدہ مند ہے۔" انسانوں کی دوڑ میں کچھ بہترین ہیں اور جو بہترین ہے، وہ انسانوں کیلئے بہترین ہے۔

اس خیال کا آنا کہ میں کسی بھی عمر میں کچھ نیا کوشش کرسکتا ہوں، بذات خود اللہ تعالیٰ کا انعام ہے۔ ایک طریقہ یہ ہے کہ آپ کی کمائی کا جو ذریعہ ہے، وہی رہنے دیں لیکن شوق ضرور پالیں۔ شوق میں یہ شرط رکھیں کہ کرتے جانا ہے، کرتے جانا ہے۔ ایک وقت آئے گا کہ اللہ تعالیٰ اس سے عزت اور برکت ضرور دے گا، کیونکہ جس طرح خواہشیں بھی پل کر جوان ہوتی ہیں، اسی طرح شوق بھی جوان ہوتا ہے۔

اپنی توانائیاں سینت کر نہ رکھیے

جو شخص اپنی انرجی بچا کر رکھتا ہے، وہ خوش نہیں ہوسکتا۔ وہ سمجھ رہا ہوتا ہے کہ اس کو میں کبھی اگلے وقت میں استعمال کروں گا، حالانکہ یہ سراسر دھوکا ہے، کیونکہ کل کا کسی کو نہیں پتا۔ یہی فکر مندی کہ میں اگلے وقت میں کروں گا، اسے خوش نہیں ہونے دیتی۔ آج کا وقت پھر کبھی نہیں آنا۔ آج کی جوانی کبھی واپس نہیں آنی۔ جو آج کے لمحات کبھی نہیں آنے، اس لیے اپنا سب سے بہترین آج کو دیجیے۔

اپنے شوق اور جذبے کو کبھی بچا کر نہ رکھیں اور کبھی انتظار نہ کیجیے کہ کوئی آئیڈیل وقت آئے گا تو پھر اس کا استعمال ہوگا۔ آپ کا جو بھی شوق ہے اسے غذا ضرور فراہم کیجیے۔ یہ غذا دو طرح کی ہوتی ہے۔ ایک زندہ رہنے کیلئے اور ایک جنون کیلئے۔ اس لیے اپنے شوق اور جذبے کی غذا کا انتظام کیجیے۔ اس کیلئے فہرست بنایئے کیا کیا کام ایسے ہیں جو آپ کے شوق کو بڑھاوا دے سکتے ہیں۔ اپنے شوق کو موٹیویٹ رکھنے کیلئے ایسے دوست ضرور بنایئے جن سے موٹیویشن ملے اور جو شوق اور جذبے کو بڑھانے میں معاون ثابت ہوں۔ آپ کو جیسا شوق ہے، ایسے ہی شوق والوں کے ساتھ اٹھیں بیٹھیں۔ یہ صحبت موٹیویشن کا باعث بنے گی۔ ممتاز اور منفرد افراد کی کہانیاں پڑھیں۔ یہ بھی موٹیویشن کا باعث بنیں گی۔ ایسی ویڈیوز دیکھیں جو موٹیویشن کا باعث بنیں۔ کمال یہ ہے کہ جیسے شہد کی مکھی رس نکال کر شہد بنا لیتی ہے، آپ جو بننا چاہتے ہیں وہ اس دنیا سے نکال کر خود بنائیں۔ انہی فلموں، انہی کہانیوں، انہی شخصیات، انہی کتابوں اور انہی لوگوں سے اپنا شہد بنائیں اور وہی آپ کا شوق ہوگا، وہی جذبہ ہوگا۔ اللہ تعالیٰ سے دعا مانگئے کہ "اے اللہ، ہمیں عزت والی شناخت عطا کر۔" یہ اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا انعام ہے۔ یہ شناخت روٹی سے، پیسے سے اور گاڑی سے بڑا انعام ہے۔

ہمیں لگتا ہے کہ ہم کسی کمپنی کیلئے کر رہے ہیں جبکہ حقیقت میں ہم قدرت کیلئے کام کر رہے ہوتے ہیں۔ آدمی کی محنت کا محافظ باس نہیں ہوسکتا، کمپنی نہیں ہوسکتی، دکان نہیں ہوسکتی۔ وہ صرف قدرت ہوسکتی ہے۔ ہمارا معاوضہ ہماری محنت کی ایک معمولی شکل ہے۔ یہ تنخواہ سب کچھ نہیں ہے۔ محنت کا ایک حصہ قدرت کے پاس بھی جمع ہوتا رہتا ہے جو اسے رکھتی جاتی ہے۔ اس لیے جو شخص اپنی بہترین صلاحیت استعمال کرتا ہے تو پھر قدرت اس کی محنت کے صلے میں اسے ممتاز کر دیتی ہے۔

قدرت کے پاس ہماری محنت کو سنبھالنے کیلئے بہت جگہ ہے اور اس کا صلہ ہمیں بہتر وقت میں بہترین دیتی ہے، کیونکہ قدرت اس نظارے کو دیکھ رہی ہوتی ہے جسے انسان کی آنکھ نہیں دیکھ سکتی۔ بعض اوقات آدمی اپنی صلاحیتوں کا بہترین استعمال کرتا ہے، لیکن کمپنی اس کی صلاحیتوں کا اعتراف نہیں کرتی۔ لیکن قدرت اس کے خلوص کو اپنے پاس محفوظ کرتی چلی جاتی ہے۔ ایک گڈریا اپنے گدھے کو لیے سڑک پر جا رہا تھا کہ اسے سڑک پر پڑا ہیرے کا ہار ملا۔ اس نے وہ ہار اٹھایا اور گدھے کے گلے میں ڈال دیا۔ پھر آگے چل پڑا۔ ابھی تھوڑی دور ہی گیا تھا کہ ایک جوہری نے گدھے کے گلے میں وہ قیمتی ہار دیکھ لیا۔ وہ سستے داموں یہ ہار خرید کر لے آیا اور جا کر بادشاہ کو پیش کیا۔ اس کا قیمتی ہیرا ملکہ کے تاج میں لگایا گیا تو جوہری نے کہا کہ "جس چیز نے جہاں پہنچنا ہے، وہاں اس نے پہنچ ہی جانا ہے۔" ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ ہم ہیرے ہوتے ہیں، لیکن وقتی طور پر پتھر بن جاتے ہیں۔ جیسے جوہری نے ہیرے کی قیمت کو شناخت کر لیا، اور گدھے والا اسے گدھے کے گلے میں ڈال کر گھومتا پھرا، ہم اپنے آپ کو شناخت نہیں کر پاتے، لہٰذا اپنے ساتھ گدھے والا حشر کرتے رہتے ہیں۔

ایک جگہ سے مطمئن نہ ہوں، خود کو بہتر کرتے رہیے

اپنے آپ کو مانجھتے رہیے۔ خبر نہیں کہ کب نگاہِ قدرت میں آ جائیں، خبر نہیں کہ کب پتھر تراش اپنی نگاہوں میں لے آئے، کب بنانے والا آپ کو بنا جائے۔ جب آپ اپنی بہترین صلاحیتیں استعمال کرتے ہیں تو کبھی دنیا سے توقع نہ رکھیں بلکہ اپنے آپ سے توقع رکھیے۔ اپنے آپ سے سوال کیجیے کہ قدرت نے جو توانائی مجھے دی ہے، کیا میں نے اس کا پورا استعمال کیا ہے؟ کیا اسے بہترین جگہ استعمال کیا ہے؟ لوگ اپنی توانائیوں کو پورا استعمال کرتے ہیں نہ درست جگہ استعمال کرتے ہیں۔ اس کی وجہ سے نتیجہ مختلف ہوتا ہے۔

جب ہم صبح اٹھتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ہماری جیب میں چوبیس گھنٹے ڈالتا ہے۔ ہم نے انھی چوبیس گھنٹے میں کام کرنا ہوتا ہے، اسی میں آرام کرنا ہوتا ہے، اسی میں کھانا کھانا ہوتا ہے، اسی میں شکر ادا کرنا ہوتا ہے، اسی میں عبادت کرنی ہوتی ہے، اسی میں احترام کرنا ہوتا ہے، غرض چوبیس گھنٹوں میں سب کچھ کرنا ہوتا ہے۔ لیکن ہم ان چوبیس گھنٹوں کا صحیح اور بہترین استعمال نہیں کرتے پھر زبان پر گلے شکوے لاتے ہیں۔

تین دروازے

اپنی زندگی میں تین دروازے ہمیشہ کھلے رکھیے۔ پہلا دروازہ کتاب، دوسرا انسانوں سے سیکھنا، تیسرا ہمیشہ اپنے ہوش و حواس قائم رکھنا اور ان کا صحیح

استعمال کرنا۔ جب کتابیں، انسان اور مواقع مل جاتے ہیں تو پھر رٹا نہیں لگانا پڑتا، کیونکہ رٹا اُس چیز کا لگایا جاتا ہے جس کے نمبر لینے ہوتے ہیں۔ درج بالا تینوں چیزیں آدمی کے اندر احساس پیدا کرتی ہیں اور اس کی سوچ بدلتی ہیں۔ اگر سوچ میں تھوڑی سی بھی تبدیلی آتی ہے تو یہ انجام تک پہنچتے پہنچتے بہت بڑی تبدیلی بن جاتی ہے۔ جس طرح کپڑے پر تھوڑا سا چھید لگتا ہے تو پھر یہ تھوڑا سا چھید کچھ ہی وقت میں پورا کپڑا اپھاڑ دیتا ہے۔

زمانہ سب سے بڑی کتاب ہے۔ یہ انسان کو سکھاتا ہے۔ تجربہ سب سے بڑا مرشد ہے۔ یہ انسان کو سکھاتا ہے۔ اس لیے زمانے اور تجربے کو کبھی نظرانداز نہ کیجیے۔ جب آدمی ان سب چیزوں کو سامنے رکھتا ہے تو پھر وہ اپنے موضوع کا ماہر بن جاتا ہے، پھر یاد نہیں کرنا پڑتا۔ جس طرح سب کو اپنے گھر کا راستہ یاد ہوتا ہے، اسی طرح جو نظریات آدمی کے اپنے ہوتے ہیں، انھیں بھی یاد نہیں کرنا پڑتا۔ جو نظریات نتائج نہیں دے رہے، وہ سب غلط ہیں۔ جو نظریہ یا تصور مطلوبہ نتیجہ دیتا ہے، وہ درست ہے۔ ہر وہ علم جس کے ساتھ عملی نتیجہ ہے، اس علم کی قدر کیجیے، کیونکہ وہ علم نافع ہے۔

اللہ تعالیٰ پر ایمان نفع ہے۔ سکونِ قلب نفع ہے۔ عزت نفع ہے۔ لوگوں کے دلوں میں احترام نفع ہے۔ کام کیلئے جذبہ اور جنون نفع ہے۔ تعلقات نفع ہے۔ جو آدمی کام کی قدر کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کی قدر لوگوں کے دلوں میں ڈال دیتے ہیں۔ جو آدمی اپنے کام کی قدر نہیں کرتا، اس کی قدر نہیں ہوتی۔ دنیا میں جتنے لوگوں کی قدر ہو رہی ہے، انھوں نے اپنے کام کی قدر کی تو ان کی قدر ہوئی، اس لیے قدر و منزلت کا بڑھ جانا نفع ہے۔

نفع کا تصور بدلیے۔ اس تصور کو محدود نہ کیجیے۔ تنخواہ نفع کا ایک معمولی سا حصہ ہے۔ اس کے علاوہ نیک اولاد نفع ہے، ساتھ چلنے والا پارٹنر بھی نفع ہے۔

سوچ اور تصورات بدل جائیں تو نتائج بدلنے لگتے ہیں۔ جب تک سوچ نہ بدلے، نتیجے نہیں بدلتے۔ اگر کسی کے ساتھ بڑی نیکی کرنی ہے تو اسے سوچ دیجیے، کیونکہ سوچ بدلے بغیر زندگی بہت خطرناک ہے۔ سوچ بدلے بغیر عہدہ بڑا خوفناک ہے اور سوچ بدلے بغیر رزق بھی بڑا خوفناک ہے۔

بہترین اخلاق

اپنی زندگی میں اخلاق بہترین کر لیجیے، مواقع ملنا شروع ہو جائیں گے۔ اچھے لوگ ملنا شروع ہو جائیں گے۔ آپ کی روٹی کے مسائل ختم ہو جائیں گے۔ اپنے کام کے صلے کا ایک حصہ اپنے اللہ سے لیجیے۔ کچھ ایسا ہونا چاہیے جس کا صلہ اللہ تعالیٰ نے دینا ہو، یعنی کچھ کام ایسا بھی ہونا چاہیے جو چھپ کر ہو، جس کا کوئی گواہ نہ ہو۔ اس میں بڑا لطف ہے۔

چیزوں کو بہترین انداز میں کرنا سیکھیے۔ آپ جو کچھ کر رہے ہیں، اسے مزید اچھے انداز میں کرنا سیکھیں۔ اپنی خدمات کا معیار بہتر کیجیے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ آدمی کامیابی کا مزاج ایک کام سے لیتا ہو، جبکہ ترقی کسی اور کام میں کر جائے۔ یہ دیکھیے کہ کون سا کام اچھا مزاج دیتا ہے۔ جس طرح عبدالستار ایدھی مرحوم نے کہا تھا کہ میری ماں کے دکھ نے میرے اندر ہمدردی کا جذبہ پیدا کیا۔ دنیا میں کئی چیزیں کہیں پڑی ہوتی ہیں، وہ ملتی کہیں اور ہیں۔ ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ کون سا مزاج کہاں سے ملا ہے۔

معیار کیوں کر بہتر کیا جا سکتا ہے

اس بارے میں ہمیشہ سوچا کیجیے کہ کام کی کوالٹی کو کیسے بہتر کیا جا سکتا ہے۔ ہمیشہ بہتری کی گنجائش رکھیں۔ بہترین سوچ پیدا کیجیے۔ یہ دیکھیے کہ میری سوچ معیاری ہے کہ نہیں۔ اپنی سوچ کا کبھی کبھی محاسبہ کیا کیجیے۔ جب بھی کسی میں کوئی اچھی چیز دیکھیں، اسے اپنانے کی کوشش کیجیے۔

اپنی زندگی میں کمٹمنٹ بڑھائیے۔ وہ تمام وعدے جو خود سے کیے ہیں، انھیں پورا کیجیے۔ وہ تمام وعدے جو اللہ تعالیٰ سے کیے ہیں، انھیں پورا کیجیے۔

کسی بھی کام کے کچھ اصول متعین ہوتے ہیں، لیکن ان میں کچھ اپنے اصول بھی شامل کیجیے۔ یہ وہ اصول ہیں جو آپ اپنے تجربے سے سیکھتے ہیں۔

(زیرِ طبع کتاب ''سوچ کا ہمالیہ'' سے)

ٹیلنٹ - چھپا خزانہ

ہمارا ٹیلنٹ ہماری ذات میں چھپا ہوا قدرت کا ایک خزانہ ہے۔ یہ وہ انعام ہے جو اللہ تعالیٰ نے انسان کے اندر رکھا ہے۔ جس کام کے متعلق انسان کے اندر یہ خزانہ ہوتا ہے، نہ چاہتے ہوئے بھی انسان کا ہاتھ اس کام کی طرف چلا جاتا ہے، آنکھ اس طرف اٹھ جاتی ہے، یہاں تک کہ قلبی سکون بھی اسی کام سے ملتا ہے۔ جب تک اس ٹیلنٹ کا اظہار نہ ہو جائے، یہ ٹیلنٹ انسان کو تنگ کرتا رہتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں، یوں کہہ لیجیے کہ ٹیلنٹ شرارتی بچے کی طرح ہوتا ہے۔ حضرت واصف علی واصف ؒ فرماتے ہیں، ''جو اصل ٹیچر ہے وہ خود شناسی میں معاون ہوتا ہے۔'' وہ آدمی کے اصل کو اس کے قریب کر دیتا ہے۔

ٹیلنٹ قربانی دینے پر مجبور کرتا ہے، وقت سے آزاد کر دیتا ہے، وقت گزرنے کا احساس نہیں ہوتا، معاوضے کی پروا سے بھی آزاد کر دیتا ہے، معلومات اکٹھی ہونا شروع ہو جاتی ہیں، اس ٹیلنٹ کے متعلق لوگ قریب آنا شروع ہو جاتے ہیں، قدرت اس کے راستے بنانا شروع کر دیتی ہے۔ جو بھی ٹیلنٹ ہوگا، قدرت اشارے دینا شروع کر دیتی ہے۔ قدرت بتا رہی ہوتی ہے کہ آپ کو کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا۔ جب آدمی اپنے ٹیلنٹ کو تلاش کر لیتا ہے تو پھر وہ درویش بن جاتا ہے جو جنگل میں بھی ڈیرا لگاتا ہے تو لوگ چل چل کر اس کے پاس آنے لگتے ہیں اور پگڈنڈیاں بن جاتی ہیں۔

اندر کی آواز کی پیروی

ہمارے والدین، اساتذہ اور ہمارے بڑے ہمارے ٹیلنٹ کے پر کاٹ ڈالتے ہیں۔ یہ پر خواب دیکھنے والے پر ہوتے ہیں، یہ ویژن والے پر
ہوتے ہیں۔ اشفاق احمد ؒ فرماتے ہیں کہ سب کچھ مار دو، لیکن کبھی اپنے اندر کا بچہ نہ مارو۔ یہ وہ بچہ ہوتا ہے جو سکھانے اور سیکھنے پر مجبور کرتا ہے۔ وقت گزرنے
کے ساتھ ساتھ ہمیں سب کچھ آ جاتا ہے، لیکن خواب دیکھنا بھول جاتے ہیں۔ خواب دیکھنا ایک بڑا کام ہے اور بڑے کاموں کا آغاز خواب سے ہوتا ہے۔ ہم
سے سب سے پہلی چیز جو چھنی جاتی ہے، وہ خواب دیکھنے کی صلاحیت ہے۔ ہم سے خواب دیکھنے کی صلاحیت چھین لی جاتی ہے۔ جب ہم خواب نہیں دیکھتے تو
پھر کسی کام کا آغاز ہی نہیں ہوتا۔ ہم اپنے آپ کو پابند کر دیتے ہیں اور بھول جاتے ہیں کہ دنیا کے جتنے بڑے لوگ ہیں، ان کی تعلیم کچھ بھی تھی، تجربہ بھی کچھ تھا،
لیکن انھوں نے غیر معمولی کام اسی شعبے میں کر کے میں دکھایا جس کا خواب دیکھا تھا۔ ہم خواب دیکھے بغیر کچھ نہیں کر سکتے، خاص کر بڑا اور غیر معمولی کرنے کیلئے
تو پہلے خواب دیکھنا ضروری ہے۔ لازم نہیں کہ آپ نے جس شعبے کی ڈگری لے رکھی ہے، اسی ڈگری کے خواب بھی آپ کو آتے ہوں۔ اگر آپ خواب نہیں
لائیے۔
دیکھیں گے تو آپ کی زندگی کا آغاز نہیں ہوگا۔ اور اس کیلئے ضروری ہے کہ اپنے اندر کے خداداد ٹیلنٹ کو تلاش کر کے سامنے لائیے۔

خود کو کیسے بدلا جائے؟

خود کو بدلنے کا مطلب یہ ہے کہ اپنے اندر کی خامیوں کو، کمیوں کو، کوتاہیوں اور کمزوریوں کو تلاش کیا جائے اور پھر انھیں بہتر بنانے کی کوشش کی جائے۔ اپنی ذات کی بہتری کا سفر دراصل خود کو بہتر بنانے کا ایک سفر ہے۔ خود کو بدلے بغیر دنیا کو نہیں بدلا جا سکتا۔ دنیا کو بدلنے کیلئے سب سے پہلے خود کو بدلنا پڑے گا۔ خود کو بدلے بغیر دنیا کو نہیں بدلا جا سکتا۔

انسان خوبیوں اور خامیوں کا مجموعہ ہے۔ کسی بھی شخص میں صرف خوبیاں نہیں ہو سکتیں اور نہ کسی شخص میں صرف خامیاں پائی جا سکتی ہیں۔ ہر شخص میں کہیں نہ کہیں کوئی خامی ضرور پائی جاتی ہے۔ کسی بھی بڑے انسان کی زندگی کو پڑھا جائے اور اس کی کامیابی کو دیکھا جائے تو پتا چلے گا کہ وہ پیدائشی عظیم تھا یا پھر کہیں سے اسے عظمت ملی یا پھر اس نے کہیں سے اپنی عظمت کے سفر کا آغاز کیا۔ جب اس نے اپنی عظمت کے سفر کا آغاز کیا تھا تو لوگوں کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ ایک دن یہ عظمت پالے گا، کیونکہ جب اس نے پہلا قدم اٹھایا تھا تو لگتا نہیں تھا کہ اتنا لمبا سفر طے ہو جائے گا۔ لیکن یہ اس کا شوق اور لگن تھا جس نے اتنا طویل سفر طے کرایا۔

جو شخص کہیں پہنچنا چاہتا ہے، وہ مشورہ لیتا ہے، منزل کا پوچھتا ہے، راستے کا انتخاب کرتا ہے، راستے میں غلطیاں کرتا ہے، پھر غلطیوں کو مان کر اپنے اصل راستے پر آ جاتا ہے اور آخر کار منزل پا لیتا ہے۔

بعض لوگوں کو یہ زعم ہوتا ہے کہ وہ پرفیکٹ ہیں، اُن میں کوئی خامی نہیں۔ اس مزاج کی کئی وجوہ ہوتی ہیں۔ بعض اوقات کوئی پوزیشن، کوئی جاب یا پھر کوئی عہدہ ایسا ہوتا ہے جو اُن میں خود پسندی اور اکڑ پیدا کر دیتا ہے۔ جیسے ایڈمنسٹریشن آفیسر چاہتے نہ چاہتے اپنے پروفیشن کے مزاج کی وجہ سے اس مزاج کو اپنی زندگی میں شامل کر لیتے ہیں۔ حالانکہ اس مزاج کو جاب کے دوران اپنے اوپر طاری کرنا جتنا ضروری ہے، اتنا ہی ضروری اپنی ذاتی اور گھریلو زندگی میں اسے چھوڑنا ہے۔ اگر جاب والا مزاج مستقل ہو جائے تو ارد گرد رہنے والے لوگ تکلیف میں چلے جاتے ہیں۔ جو لوگ اپنے جاب والے مزاج کو اپنے گھر لے جاتے ہیں، وہ اپنی دفتری حیثیت کو اپنے گھر والوں سے منوانا چاہتے ہیں۔ یہ انداز انھیں نہ جاب پر بہتر کارکردگی دکھانے دیتا ہے، اور نہ گھر والوں کو قریب کرتا ہے۔

لوگوں کی بہت بڑی تعداد ایسی ہے جن میں غلطی کو تلاش کرنے کا مزاج نہیں پایا جاتا۔ زیادہ تر لوگ اپنی غلطی ماننے کو تیار نہیں ہوتے۔ وہ لوگ اس ضد میں ہوتے ہیں کہ میں ٹھیک ہوں، ساری دنیا غلط ہے۔ جب کسی فرد کے اندر یہ فلسفہ پایا جائے کہ ساری دنیا غلط ہے اور میں ٹھیک ہوں تو پھر اصلاح کی گنجائش ختم ہو جاتی ہے۔ اصلاح ہمیشہ اس کی ہوتی ہے جو اصلاح لینا چاہتا ہے، جو اپنی اصلاح کرنا چاہتا ہے۔ جو یہ مانتا ہے کہ تمام تر عقل مندیوں اور عہدوں کے باوجود کہیں نہ کہیں مجھ میں خامی ضرور پائی جاتی ہے۔

خود کو نہ بدلنے کا نقصان یہ ہوتا ہے کہ آدمی میں خود پسندی آ جاتی ہے۔ خود پسندی نفس کا ایک وار ہے۔ نفس جب قوی ہوتا ہے تو وہ خود پسندی کی طرف لاتا ہے۔ کوئی بھی انسان پرفیکٹ نہیں ہو سکتا۔ پرفیکٹ صرف اللہ تعالیٰ اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہے۔ پرفیکٹ انسان ہی بہتری کی طرف جا سکتا ہے۔

جب آدمی پرفیکشن کا مزاج اپناتا ہے تو وہ اس غلط فہمی کا شکار ہو جاتا ہے کہ میں پرفیکٹ ہوں اور میری کہی ہوئی بات سو فیصد ٹھیک ہے۔ اس فرد میں آگے جا کر کہیں نہ کہیں خود پسندی کا رویہ پیدا ہو جاتا ہے۔ بعض لوگوں سے اپنی بری عادات نہیں چھوڑی جاتیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان لوگوں کو برائی کے نقصانات کا نہیں پتا ہوتا۔ جب برائی کے نقصان کا اندازہ ہوتا ہے تو پھر برائی کو چھوڑنا آسان ہو جاتا ہے۔ بعض لوگوں کو اپنی برائیاں نظر نہیں آتیں۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ وہ آئینے کے محتاج ہوتے ہیں۔ جب تک وہ آئینے نہیں ہوں گے، تب تک برائیاں نظر نہیں آئیں گی۔

بعض لوگ خود تو بدل جاتے ہیں، لیکن جب معاشرے میں منفیت دیکھتے ہیں تو مایوس ہو جاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو دیکھنا چاہیے کہ کیا ان میں اتنی ہمت ہے کہ وہ حق کیلئے لڑ سکتے ہیں؟ کیا وہ حق کیلئے زبان کا استعمال کر سکتے ہیں یا پھر برائی کو دل میں برا جانتے ہیں؟

جو انسان خود کو بدلتا ہے، اس کے رویے میں اتنی تبدیلی ضرور آنی چاہیے کہ اس کے ساتھ والوں پر اس تبدیلی کا اثر پڑے۔ کیونکہ ایک چلتا ہے تو قافلہ بنتا ہے۔ ایسے شخص کی تبدیلی کیا تبدیلی۔۔۔ جس کے بدلنے سے ساتھ والوں پر کوئی اثر نہ پڑے۔ حضرت واصف علی واصفؒ فرماتے ہیں، ''ناپسندیدہ انسان سے پیار کرو، اس کا کردار بدل جائے گا۔''

جو شخص زیادہ مضبوط نہیں ہوگا، اگر اس نے اپنے آپ کو بدلا بھی ہوگا لیکن منفی لوگوں کا اثر لے گا۔ ایسے شخص کو چاہیے کہ وہ اپنی سنگت اچھے اور مثبت لوگوں میں رکھے۔ وہ لوگ جلدی بدلتے ہیں جن کی زندگی میں کوئی انسپائریشن ہوتی ہے۔ انسپائریشن کا مطلب ہے کہ وہ لوگ کسی سے متاثر ہو گئے ہیں۔ اگر آپ کسی کے عمل سے متاثر ہیں، کسی کے علم سے متاثر ہیں، کسی کے کردار سے متاثر ہیں، کسی کی سوچ سے متاثر ہیں یا پھر کسی کے نظریے سے متاثر ہیں تو پھر بدلنا آسان ہو جاتا ہے۔

انسپائریشن رسولوں اور پیغمبروں کا شیوا ہے۔ اللہ تعالیٰ بعض لوگوں میں روحانیت رکھ دیتا ہے۔ ایسے لوگوں کی مجلس میں بیٹھنے سے دلوں کی حالت بدل جاتی ہے۔ ایک فرد جب ان کی محفل میں بیٹھتا ہے تو اُن کی محبت وصول کرتا ہے، ان کی شفقت سے متاثر ہوتا ہے جس کی وجہ سے اس میں تبدیلی آنا شروع ہو جاتی ہے۔ وہ لوگ خوش نصیب ہوتے ہیں جن کو بڑے لوگوں کا ساتھ مل جاتا ہے۔ لیکن بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں جنھیں بڑے بڑے لوگوں کی صحبت میسر ہوتی ہے، لیکن پھر بھی ان میں تبدیلی نہیں آتی۔ یہ کسی حد تک نصیب کی بھی بات ہے۔ خوش نصیبی یہ ہوتی ہے کہ آدمی کی زندگی میں اچھے لوگ آئے اور ان کی سنگت کی وجہ سے اس میں ایسی تبدیلی آئی جس کے متعلق اس نے کبھی سوچا ہی نہیں تھا۔

بعض لوگ تبدیلی سے ڈرتے ہیں۔ انھوں نے اپنی زندگی میں ایسے تجربات کیے ہوئے ہوتے ہیں کہ جن کی وجہ سے ان میں خود کو بدلنے کا حوصلہ نہیں رہتا۔ یہ ایک بے بنیاد خوف ہے۔ دنیا کا ہر شخص جو تبدیلی کو دیکھتا ہے تو اس کے متعلق سوچتا بھی ہے۔ آج دنیا میں چینج مینجمنٹ پڑھائی جا رہی ہے کہ بدلتے ہوئے حالات میں اپنے آپ کو کیسے لے کر چلنا ہے۔ اداروں میں ملازمین رکھنے کے طریقے بدل رہے ہیں۔ کام کرانے کے طریقے بدل رہے ہیں۔ کام کے بارے میں نظریات بدل رہے ہیں۔ ڈارون کہتا ہے کہ تمام انواع کی تاریخ کے مطابق زندہ وہی رہا جس نے تبدیلی کو قبول کیا ہے۔ جس نے تبدیلی کو قبول کیا ہے، اسے بقا ملی ہے۔

وہ کاروباری جو زمانے کی تبدیلی کے ساتھ اپنے کاروبار میں تبدیلی نہیں لاتے، اُن کا کاروبار ختم ہو جاتا ہے۔ جو شخص تبدیلی کو قبول کرنا چاہتا ہے اور تبدیلی سے ڈرتا ہے، اسے چاہیے کہ تبدیلی کی جانب کم از کم ایک قدم تو اٹھائے، کیونکہ قدم اٹھانے سے خوف کی شدت کم ہو جاتی ہے۔

ہم نے بچپن میں His First Flight کہانی پڑھی تھی۔ اس کہانی میں خوف کے باوجود سیگل کی ماں اپنے بچے کو دھکا دے دیتی ہے۔ اس سے بہ ظاہر لگتا ہے کہ اس نے اپنے بچے کے ساتھ بڑی بے رحمی کی ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ سیگل اس بہ ظاہر بے رحمی کے نتیجے میں اُڑنا سیکھ جاتا ہے۔ جو انسان خوف کے ہوتے ہوئے خوف پر قابو نہیں پاتا، وہ ترقی نہیں کر سکتا۔

خوف پر قابو پانے کیلئے دو چیزیں ضروری ہیں۔ پہلی شے فیصلہ ہے اور دوسرا خود پر یقین (خود یقینی)۔ جب آدمی خود پر یقین کرتے ہوئے فیصلہ کرتا ہے تو پھر اسے دنیا کی کوئی پروا نہیں رہتی۔ بابا جی اشفاق احمدؒ اپنے ڈرامے ''من چلے کا سودا'' میں لکھتے ہیں کہ خوف انسان کا ازلی دشمن ہے۔ اس نے ہمیشہ انسان کی کارکردگی کو محدود کیا ہے۔ خوف کہتا ہے کہ تمھیں بدلنا نہیں ہے، تمھیں کمفرٹ زون میں رہنا ہے، جبکہ ناکامی ہی کامیابی کی بنیاد ہے۔ ناکامی کے بغیر کامیابی نہیں ملتی۔ ناکامی کامیابی کی طرف پہلا قدم بنتی ہے۔ اور خوف اس میں اہم عامل کا کردار ادا کرتا ہے۔۔۔ بہ شرط یہ کہ اسے تسلیم کر کے اس کا سامنا کر لیا جائے۔

جس شخص کے بہت زیادہ مقاصد ہوں، وہ تکلیف میں رہتا ہے۔ بہت زیادہ مقاصد رکھنے والا اضطراب کا شکار ہو جاتا ہے۔ مقصد محدود اور تھوڑے ہونے چاہئیں، لیکن سوچ بہت وسیع اور بلند ہونی چاہیے۔ مقصد ایک ہو اور توکل اللہ تعالیٰ پر ہو۔ مقصد ایک، لیکن توانائی بھرپور ہونی چاہیے۔ مقصد ایک، لیکن اس کیلئے دعا دل کی گہرائیوں سے مانگنی چاہیے۔

ہمت کے بغیر ایک ہی وقت میں بہت ساری چیزیں اکٹھا کرنے والا تکلیف کا شکار ہو جاتا ہے۔ ہمت وقت کے ساتھ ساتھ آتی ہے۔ جو یقین کے ساتھ

قدم اٹھاتا ہے، منزلیں اسی کا انتظار کرتی ہیں۔ جو یقین کے ساتھ قدم اٹھاتا ہے، اللہ تعالیٰ کہیں نہ کہیں، کبھی نہ کبھی اس کیلئے اسباب ضرور پیدا کر دیتا ہے۔ جو شخص یہ کہتا ہے کہ غربت بہت ہے، مسئلے بہت ہیں، اسے چاہیے کہ جو کچھ اس کے پاس ہے، اسی سے گزارا کرے۔ لیکن آغاز ضرور کرے۔ کامیاب کہانی کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ آدمی ''مائنس'' سے نکل ''پلس'' میں چلا جائے۔

مثبت تبدیلی کا مطلب ہے کہ سب سے پہلے اپنی سوچ کو مثبت کیا جائے۔ اگر سوچ مثبت ہوگی تو نظریہ مثبت ہوگا، نظریہ مثبت ہوگا تو رویہ مثبت ہوگا، رویہ مثبت ہوگا تو عمل مثبت ہوگا اور جب عمل مثبت ہوگا تو پھر نتیجہ بھی مثبت ہوگا۔ ایک مثبت نتیجے کیلئے ایک مثبت تبدیلی چاہیے۔ اس مثبت تبدیلی کے بغیر کبھی بھی مثبت نتیجہ نہیں آئے گا۔ ایک وقت وہ تھا کہ جب موبائل فون موجودہ سائز کے مقابلے میں سے خاصا بڑا ہوتا تھا۔ پھر ٹیکنالوجی میں ترقی کے ساتھ ساتھ اس کا سائز کم ہوتے ہوتے یہاں تک پہنچ گیا کہ آج ایسے فون آگئے ہیں کہ اگر وہ کسی کے پاس ہوں تو جہاز میں بیٹھنے کی اجازت نہیں ملتی۔ آج دنیا بڑے موبائل سے اسمارٹ موبائل پر چلی گئی ہے۔ جب چیزیں اتنی تیزی سے بدل رہی ہیں تو پھر انسان کو بھی بدلنے کی ضرورت ہے۔ یہ تبدیلی کائنات کے فطری نظام میں شامل ہے۔ تمام فطری مظاہر تبدیل ہو رہے ہیں اور خود کو بدلتے رہتے ہیں۔ چنانچہ اس دنیا میں اگر ہم خود کو نہیں بدلیں گے تو پھر یہ دنیا بدلی ہوئی نظر نہیں آئے گی۔

ٹیکنالوجی کی رفتار میں تیزی کے باعث آج بہت سے کام جو کچھ عشرے پہلے تک طویل عرصہ لیتے تھے، آپ چند ماہ میں کرنا ممکن ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آج کمیونیکیشن اور ابلاغ کے ذرائع اتنے وسیع اور ترقی یافتہ ہو چکے ہیں کہ اگر کسی کے پاس آئیڈیا ہے تو وہ بہت کم وقت میں کہیں سے کہیں پہنچ سکتا ہے۔ فیسبک ایک آئیڈیا ہے، گوگل ایک آئیڈیا ہے، واٹسیپ ایک آئیڈیا ہے، یوٹیوب ایک آئیڈیا ہے۔ ان آئیڈیاز کی وجہ سے لوگ دنوں میں ارب پتی بن گئے۔ دنیا چند سال میں ویب سائٹ پر آگئی ہے۔ اگر کسی کو گاڑی خریدنی ہے تو ویب سائٹ وزٹ کرنے سے اسے اچھی گاڑی مل سکتی ہے۔ ایک کال پر کھانا گھر پر پہنچ جاتا ہے۔

اس کے باوجود آج بھی ایک ایسا طبقہ موجود ہے جو یہ کہتا ہے کہ یہ سب کتابی باتیں ہیں۔ ان میں حوصلہ اور ظرف موجود نہیں ہے۔ وہ لوگ اپنے دلوں کی تنگی کی وجہ سے کسی کی کامیابی کو نہیں مانتے۔ خود کو بدلنے کیلئے اپنے دل کی تنگی کو توڑنا پڑے گا۔

اللہ تعالیٰ کا سب سے بڑا کرم ''ہدایت'' ہے اور ہدایت مانگنے سے ملتی ہے۔ ہدایت وہ مانگتا ہے جسے ہدایت کی طلب ہوتی ہے۔ ہدایت وہ مانگتا ہے جو چاہتا ہے کہ مجھے ہدایت چاہیے۔ ہدایت وہ مانگتا ہے جو خود کو تبدیل کرنا چاہتا ہے۔ ہدایت وہ مانگتا ہے جو اپنے اندر تبدیلی کی جرات رکھتا ہے۔ جو مانتا ہی نہیں ہے کہ مجھے ہدایت چاہیے، وہ کبھی ہدایت کی طرف نہیں جائے گا۔ رات کے پچھلے پہر میں اٹھ کر اپنے آنسوؤں کو گرا کر دیکھیے۔ کبھی اپنی جبیں کو سر بہ سجدہ کر کے اللہ تعالیٰ سے ہدایت مانگ کر تو دیکھیے۔ کبھی اللہ تعالیٰ پر پورا توکل کر کے تو دیکھیے۔ کبھی اللہ تعالیٰ کو دل سے پکار کر تو دیکھیے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ کوئی ہے جس کی میں سنوں۔ جب آپ پورے یقین اور تڑپ کے ساتھ اپنے رب کو پکارتے ہیں اور کہتے ہیں کہ میرے مالک، میرے گناہ بہت زیادہ ہیں، میری کوتاہیاں بہت زیادہ ہیں، میری خامیاں بہت زیادہ ہیں لیکن میں جانتا ہوں تو کریم ہے، تو رحمان و رحیم ہے۔ میرے مالک، تو مجھے اس بھنور سے نکال۔ مجھے ذات کی اس جنگ سے نکال۔ مجھے نفس کی اس جنگ سے نکال۔ مجھے گناہوں کی دلدل سے نکال۔

جب آپ اللہ تعالیٰ پر توکل کر کے ایک قدم اٹھاتے ہیں تو وہ دس قدم آپ کی طرف آتا ہے۔ جب آپ چل کر اُس کی طرف جاتے ہیں تو وہ دوڑ کر آپ کی طرف آئے گا۔

زندگی کی تجدید

ہر شے تجدید مانگتی ہے۔ ہر چیز کو گاہے گاہے سنوارنا اور نکھارنا پڑتا ہے۔ ہماری زندگی کے کئی شعبے ایسے ہیں جن کی تجدید کے متعلق کبھی سوچا ہی نہیں جاتا۔ انتھروپالوجی انسانی مزاج کا علم ہے۔ یہ علم بتاتا ہے کہ جب انسان دنیا میں آیا تھا تو اس کو بے شمار قسم کے مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ ان مسائل میں سب سے بڑا مسئلہ اسے اپنی بقا کا تھا۔ رات کو اگر دس لوگ سوتے تو صبح کو دو تین غائب ہوتے۔ پتا چلتا کہ انھیں کوئی جنگلی جانور اٹھا کر لے گیا۔ اسی طرح، کچھ لوگ بیٹھے ہوتے تو قریب سے سانپ گزرتا اور اُن میں سے کسی ایک کو ڈس لیتا اور وہ مرجاتا۔ ان لوگوں کے پاس اسے بچانے کا کوئی سبب نہیں تھا۔ یہ سلسلہ ایک عرصہ چلتا رہا۔ جب انسان سے ان مسئلوں کا حل نہ بن پایا تو انھوں نے ان مسائل کو خدا سمجھنا شروع کر دیا۔ یہ وہ دور تھا کہ جب انسان سمجھتا تھا کہ شاید آندھی کا نام خدا ہے، شاید دیوہیکل پہاڑ خدا ہے۔ شاید آگ ہی خدا ہے۔ پھر جیسے جیسے اس میں کچھ شعور آیا تو وہ اپنی بقا کے طریقے سوچنے لگا۔ چنانچہ وہ لوگ جہاں سوتے وہاں اپنے اردگرد ایک گڑھا کھود لیتے تاکہ سانپ آئے تو گڑھے میں گر جائے۔ یہ انسان کی اپنے بقا کی شروعات اور پہلی تجدید تھی۔

شروع کے مسائل نے انسان کی جبلت کو جگایا۔ وہ جبلت یہ تھی کہ مجھے مسائل کا سامنا کرنا ہے۔ جس طرح انسان کو مسائل کا سامنا تھا، اسی طرح دوسری مخلوقات کو بھی مختلف مسائل کا سامنا تھا۔ جیسے، آندھی سے چڑیا کا گھونسلا گرجانا، لیکن اس میں تجدید کا عنصر نہیں تھا۔ اللہ نے انسان کے سوا دیگر تمام مخلوقات میں اپنا تحفظ اُن کی جبلت میں ڈال رکھا ہے۔ لہٰذا، انھیں اپنی بقا کیلئے الگ سے مشقت کر کے یہ فن سیکھنا نہیں پڑا۔ انسان دنیا کی واحد مخلوق ہے جس نے مسائل کا سامنا کرنے کا شعوری فیصلہ کیا۔ اسی خاصیت کی وجہ سے وہ اشرف المخلوقات کہلایا۔ آج انسان نے ان مسائل پر بڑی حد تک قابو پالیا ہے۔ انسان نے ایسی ادویہ ایجاد کر لی ہیں کہ جن سے خطرناک ترین امراض جو صدیوں سے بستیوں کی بستیاں اجاڑ دیتے تھے، آج قابل علاج ہیں۔ انسان نے اپنے مسائل کا حل تلاش کیا، لیکن کوئی اور مخلوق اپنے مسائل کا حل نہ کر سکی۔ آج بھی بلی اپنا پیٹ خراب ہونے پر گھاس کھاتی ہے، آج گدھا اپنی خارش دور کرنے کیلئے مٹی پر لوٹتا ہے۔ آج بھی شیروں کے رہنے کے انداز وہی ہیں جو اس دنیا کی تخلیق کے وقت تھے۔ آج بھی پرندے اپنے گھونسلے اسی طرح بناتے ہیں جیسے ہزاروں سال پہلے کے پرندے بناتے تھے۔ غرض ان کی کسی چیز میں کوئی ردوبدل نہیں آیا۔

جبلت اور مزاج

انسان کی منفرد جبلت نے انسان کے منفرد مزاج کی تشکیل کی ہے۔ البتہ، جبلت کے برخلاف، انسانی مزاج نہ صرف ہر دور میں بدلتا رہا ہے، بلکہ یہ ہر فرد کا الگ الگ ہوتا ہے۔ زندگی میں کامیابی کیلئے انسانی مزاج کا مطالعہ کیا جائے۔ انسانی مزاج کو سمجھنے کیلئے ضروری ہے کہ انسان کی تاریخ پڑھی جائے۔ مزاج کی ابتدا کو جاننے کیلئے حضرت آدم علیہ السلام کو پڑھا جائے۔ اس سے پتا چلے گا کہ زندگی گزارنے کے متعلق آپ علیہ السلام کا کیا مزاج تھا۔ مزاج کی معراج کو جاننا ہے تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ مبارکہ پڑھی جائے۔ اس سے چلے گا کہ عظمت کیا ہوتی ہے۔ کسی کو معاف کرنا ہے تو دیکھئے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کس طرح معاف کیا کرتے تھے۔ کسی سے وعدہ کرنا ہے تو دیکھئے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کیسے وعدہ وفا کیا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ مبارکہ سے پتا چلے گا کہ جو اچھا نہ سمجھے، اس کے ساتھ اچھا ہونا کتنا ضروری ہے۔ یہ پتا چلے گا کہ زیادتی کرنے والوں کو معاف کرنا کتنا ضروری ہے۔ یہ پتا چلے گا کہ تجدید کرنا کتنا ضروری ہے۔ یہ پتا چلے گا کہ چیزیں پرکھنے سے پہلے مشورہ کرنا کتنا ضروری ہے۔ یہ پتا چلے گا کہ زندگی میں پلاننگ کی کتنی اہمیت ہے۔ غرض، زندگی کا کوئی بھی گوشہ ہو، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرتِ مبارکہ نمونہ ہے۔

ارادہ اور فیصلہ کی قوت

اللہ تعالیٰ نے ارادہ جیسی بنیادی صفت صرف انسان کو بخشی۔ دنیا کی کسی اور مخلوق کو یہ صفت نہیں دی گئی۔ انسان واحد مخلوق ہے جس نے ارادہ کیا اور چاند

پر چلا گیا۔ یہ واحد مخلوق ہے جس نے خود کو ہوا میں اڑانے کیلئے جہاز بنالیے۔ یہ واحد مخلوق ہے جو مائیکرو سیکنڈ کی رفتار پر چلی گئی۔ ٹیلنٹ، کمیونیکیشن، سفر، ادویہ، ترسیل، رہائش، علم، تعلیم، کتابیں اور ٹیکنالوجی۔۔۔ یہ ساری نعمتیں اللہ تعالیٰ نے انسان کو دی ہیں۔ اور یہ اس کے ارادے کی وجہ سے وجود میں آئیں۔

بے شمار لوگ ایسے ہیں جن کے والدین بچپن میں ہی انتقال کرجاتے ہیں۔ اس کے باوجود وہ زندگی کے شدید ترین مسائل کے سامنے کھڑے ہوجاتے ہیں اور پھر ایک دن دنیا کو بتاتے ہیں کہ میں ایک کامیاب انسان ہوں۔ جو دنیا کو یہ بتاتے ہیں کہ تعلیم نہ ہونے کے باوجود بھی میں بل گیٹس (بزنس مین) بن گیا ہوں، اسکول نہ جانے کے باوجود بھی نیوٹن (سائنس داں) بن گیا ہوں۔

ارادے کی پختگی انسان کو مجبور کرتی ہے کہ وہ تجدید کرے اور آگے بڑھے۔ انسان کبھی نہیں چاہتا کہ وہ کسی ایک جگہ پر کھڑا رہے۔ وہ بہتر سے بہتر ہونا چاہتا ہے۔ انسان وہ مخلوق ہے کہ اگر آج فرض کیجیے، آپ پانچ بڑے مسائل میں پھنسے ہوئے ہیں تو پانچ سال بعد آپ کو معلوم ہوگا کہ وہ تو کب کے حل ہوچکے۔

جس قسم کے مسائل بھی کیوں نہ ہوں، انسان ان مسائل کے باوجود جینا سیکھ جاتا ہے۔ مثال کے ایک طور پر، ایک آدمی کی ٹانگ کٹ جاتی ہے۔ وہ مصنوعی ٹانگ لگا کر چلنا شروع کردے گا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس نے چیلنج کے سامنے کھڑا ہو کر ثابت کردیا کہ ایک ٹانگ نہ بھی رہے تو میں پھر بھی چل سکتا ہوں۔

مسائل نعمت ہیں

مسائل انسان کے ارادے کو باہر نکالتے ہیں۔ یہ اسے تجدید کا موقع دیتے ہیں۔ آج کوئی نہیں چاہے گا کہ وہ سو سال پیچھے چلا جائے بلکہ سو سال تو دور کی بات ہے، چند سال پیچھے جانے کو تیار نہیں ہوگا۔ کسی دانشور نے کیا خوب کہا ہے کہ انسانیت اپنے ہاتھوں کی انگلیوں سے کھرچ کھرچ کر یہاں تک پہنچی ہے۔ اسے قطعاً واپسی کی چاہت نہیں۔ رنجیت سنگھ تجدید کی اہمیت سمجھ چکا تھا، اس لیے اس نے کہا کہ میں اپنی عورتوں کو بھیک نہیں مانگنے دوں گا، بلکہ انھیں تعلیم دوں گا۔ یہی وجہ ہے کہ آج دنیا میں بھکاریوں کی سب سے کم تعداد سکھوں کی ہے، کیونکہ انھیں سمجھ آگئی کہ عورت کا تعلیم حاصل کرنا کتنا ضروری ہے۔ دنیا میں ایسے کامیاب لوگ ہیں جن کے والد پڑھے لکھے نہیں تھے، لیکن والدہ پڑھی لکھی تھیں۔ اس کے نتیجے میں سارے بچے پڑھ لکھ گئے اور کامیاب ہوگئے۔ وجہ یہ تھی کہ ماں کا شعور بچوں میں منتقل ہوا۔

ہم لوگ مسائل سے بچنا چاہتے ہیں۔ جب آدمی مسائل سے راہ فرار اختیار کرتا ہے تو اس کی قوتِ ارادہ باہر نہیں نکل پاتی۔ وہ تمام بچے جو چھاؤں میں پلتے ہیں وہ زیادہ ترقی نہیں کرتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اُن کا واسطہ کبھی مسائل سے پڑا ہی نہیں کہ وہ اپنے اندر کی قوتِ ارادہ کو کھنگالتے اور اسے باہر نکال کر اس سے کام لیتے۔ لہٰذا، جب وہ عملی زندگی میں قدم رکھتے ہیں اور جب مسئلہ سامنے پاتے ہیں تو بھاگ جاتے ہیں۔

آج کے نوجوان کی پستی

میں دیکھتا ہوں کہ انٹرمیڈیٹ کے داخلے شروع ہوتے ہیں تو اٹھارہ بیس برس کے نوجوان اپنی ماؤں کا ہاتھ تھامے کالج میں پروسپکٹس لینے آتے ہیں۔ میں سوچتا ہوں کہ ایک طرف تو وہ سترہ سال کا نوجوان تھا جو کئی سو میل کا فاصلہ طے کرکے اپنے ساتھ کئی ہزار افراد کا لشکر لے کر سندھ آیا یعنی محمد بن قاسم اور دوسری جانب آج کا مسلمان نوجوان ہے۔ بہت بڑا فرق اس نوجوان اور آج کے نوجوان میں یہی ہے کہ محمد بن قاسم کے پاس ارادہ و فیصلہ کی قوت تھی اور آج کا نوجوان اس نعمت سے محروم ہے۔

اگر آج بیس اور تیس سال کی عمر میں بھی آدمی ہر کام شروع کرنے سے پہلے اپنے والدین سے پوچھتا ہے تو سمجھ لیجیے کہ اس میں فیصلہ کرنے کی صلاحیت نہیں ہے۔ کیوں؟ اس لیے کہ اسے یہ صلاحیت سکھائی ہی نہیں گئی ہے۔ انسان زندگی میں قوتِ فیصلہ سے ترقی کرتا ہے۔ قوت فیصلہ اور قوت ارادہ نہ ہو تو وہ ستر سال کا بھی ہوجائے تو پھر بھی وہ بچہ ہی رہتا ہے۔ قوتِ ارادہ و قوتِ فیصلہ اس وقت باہر نکلتی ہے کہ جب مسائل راہ میں آتے ہیں۔ ایسے میں انسان مجبور ہوتا ہے کہ وہ اپنی تجدید کرے۔ جب انسان کو پتا ہوتا ہے کہ میرے پاس ایک بہت بڑی طاقت اور قوت موجود ہے تو وہ اسے استعمال میں لاتا ہے۔ اس کے

برخلاف، جن لوگوں کی قوت ارادہ سوئی ہوتی ہے یا مُردہ رہتی ہے، وہ لوگ ہوتے ہیں جنھوں نے زندگی میں مسائل اور مشکلات کا سامنا نہیں کیا ہوتا۔ وہ زندگی کے مسائل سے بھاگنے والے ہوتے ہیں۔ حضرت علامہ اقبالؒ فرماتے ہیں، ''تو اسے بچا بچا کے نہ رکھ''۔
مشکلات کا سامنا کرنے والے کو اللہ تعالیٰ پہلا انعام یہ دیتا ہے کہ اس کی ارادے کی قوت باہر آجاتی ہے۔

اسلام میں تجدید

اسلام نے تجدید کا سب سے حسین تصور توبہ کی صورت میں دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ مجھے توبہ بہت پسند ہے۔ پوری زندگی انسان کے پاس تجدید کا موقع ہوتا ہے۔ بندہ جتنا بھی گنہگار رہو، گناہوں کے سمندر میں ڈوبا ہوا ہو، لیکن دل میں یہ خیال آئے کہ مجھے واپس لوٹنا چاہیے تو اسے چاہیے کہ توبہ کرے۔
جب اپنی عقل زندگی کو بہتر نہ بنا رہی ہو تو اس وقت اپنی عقل پر چھلانگیں نہ لگائی جائیں۔ اس وقت یہ دعوا نہیں کرنا چاہیے کہ میں بڑا عقل مند ہوں۔ ایسی صورت میں تجدید ممکن نہیں ہوتی۔ عقل کی انتہا یہ ہے کہ زندگی میں سکون ہو۔ سکون کا مطلب ہے کہ آدمی جہاں ہو، ذہن بھی وہیں ہو۔ ذہن میں نہ ماضی کا غم ہو اور نہ مستقبل کی تشویش چل رہی ہو۔ عقل جب بھی آتی ہے تو اس کی سب سے بڑی نشانی یہ ہے ہوتی ہے کہ وہ ماضی اور مستقبل سے آزاد ہو جاتا ہے۔
زندگی میں کبھی وقت ضائع ہو جائے اور کوئی بھول ہو جائے تو فوری طور پر تجدید کیجیے۔ کوئی بات نہیں، یہ انسانوں کے ساتھ ہوتا ہے کیونکہ انسان بھولنے والی مخلوق ہے۔ انسان کا لفظ ''نسان'' سے بنا ہے جس کا مطلب ہے، بھولنا، یعنی ایسی مخلوق جو بھول جاتی ہے۔ یہ ایسی مخلوق ہے کہ اگر اپنے خالق کو دن میں پانچ بار یاد نہ کرے تو وہ اپنے خالق کو بھی بھولنے لگتی ہے۔ اس لیے اسے پانچ دفعہ یاد کرنا پڑتا ہے۔ زندگی میں کبھی وسائل ضائع ہو جائیں تو فوری طور پر سجدے میں سر رکھیے اور تجدید کیجیے۔

زندگی میں تجدید کا سب سے بہتر وقت وہ ہے کہ جب بندے کو اپنے گناہ یاد آجائیں اور شرمندگی ہو۔ یہ خوش بختی کی علامت ہے۔ یہ احساس اللہ کی بڑی نعمت ہے۔ گناہ اللہ تعالیٰ سے دور نہیں کرتا بلکہ گناہ کی یاد اللہ تعالیٰ کو پاس نہیں آنے نہیں دیتی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ گناہ کی وجہ سے خیال اتنا پراگندہ ہو جاتا ہے کہ پاک ہستی کو سوچنے کے قابل نہیں رہتا۔ کبھی گناہوں کا بوجھ محسوس ہو تو زندگی کی تجدید کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔
تجدید کا مطلب یہ ہے کہ سہارا صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہو۔ تجدید کا مطلب ہے کہ قدم اٹھے، لیکن اس کا دارومدار اللہ تعالیٰ کی ذات پر ہو۔
تجدید کے بعد دعا کریں کہ اے باری تعالیٰ، آج تجدید کیلئے میرا پہلا قدم اٹھ گیا ہے، تو مہربانی فرما اور اب اپنے وعدے کے مطابق دس قدم میری طرف آجا۔ یقین کیجیے، آپ کا ایک قدم اٹھے گا اور اللہ تعالیٰ کی رحمت سو قدم آپ کی طرف آئے گی۔
کبھی بھی زندگی میں احساس ہو کہ میں نے کسی کے ساتھ زیادتی کی ہے اور وہ مجھے نہیں کرنی چاہیے تھی تو فوری اس شخص کے پاس جائیں اور اس سے معافی مانگیں۔ یہ بھی تجدید ہے۔

تجدید کیجیے

اپنی زندگی کی تجدید کیلئے اپنے سے یہ سوال کیجیے کہ میں کیوں جی رہا ہوں، میرے جینے کا سبب کیا ہے، میں کدھر جا رہا ہوں، میں اس دنیا میں آیا کیوں تھا؟ یہ زندگی ایک بار ملی ہے، میں اس واحد اور قیمتی متاع کو کیسے برت رہا ہوں؟
اگر یہ سوالات پہلے سے آپ کے ذہن میں کلبلا رہے ہیں اور آپ کو بے چین کیے ہوئے ہیں تو یہ خوش بختی کی علامت ہے۔ اس سے استقامت ملتی ہے۔ استقامت یقین کا انعام ہے۔ جس کے پاس یقین نہیں، اس کے پاس استقامت نہیں ہوتی۔ جو یقین کی راہ پر چل نکلے، انھیں منزلوں نے پناہ دی۔
حضرت واصف علی واصفؒ فرماتے ہیں، ''زندگی کے تین حاصل بہت بڑے حاصل ہیں: یقین، یکسوئی اور استقامت۔'' یہ اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا انعام ہے کہ وہ کسی کو واحد یقین [illegible] (کتاب ''اونچی اُڑان'' سے)

پڑھنا لکھنا کافی نہیں

کتاب Millionnaire Messanger ضرور پڑھئے۔ یہ کتاب ایک ایسے فلسفے پر ہے کہ جس کے مطابق، اس وقت دنیا میں ایکسپرٹ انڈسٹری آچکی ہے۔ ہمیں پڑھے لکھے لوگ نہیں چاہئیں، ہمیں ایکسپرٹ کی ضرورت ہے۔ ہمیں ماہر فن کی ضرورت ہے۔ ایک ہے، پروفیشنل اور ایک ہے، ایکسپرٹ۔ ایکسپرٹ وہ ہوتا ہے جس کا وزڈم دیگر پروفیشنلز سے کہیں بلند ہوتا ہے۔ وہ کام کی باریکیوں کو جانتا اور سمجھتا ہے۔ وہ سکھانے کے قابل ہوتا ہے۔

ہر فرد کی کہانی ایک پروڈکٹ ہے۔ اگر اندازِ بیاں مل جائے تو پھر ہر آدمی میلنیئر (امیر) بن سکتا ہے۔ اپنی زندگی میں وہ شہد اکھٹا کیجیے جو بانٹا جا سکتا ہے۔ ایسے وزڈم پر معذرت ہے جسے بانٹنے کا حوصلہ ہی نہ ہو۔ وہ وزڈم، وہ فہم جو بانٹی جا سکے، آسانی جو شیئر کی جا سکے، وہ فہم جو بتایا جا سکے، دانش وہ جو دی جا سکے اور وہ عقل جو دی جا سکے۔ کام ایسے کیجیے کہ کل کو اگر سکھانا پڑے تو سکھا سکیں۔

جب آدمی اپنی فیلڈ میں برانڈ بنتا ہے تو ترقی شروع ہو جاتی ہے۔ برانڈ بنتا ہے تو وہ ممتاز بھی ہوتا ہے۔ اکثر لوگ اپنے برانڈ پر کام نہیں کرتے جس کی وجہ سے انھیں ترقی نہیں ملتی۔ ایسا پودا لگانا چاہیے جس کا پھل آنے والی نسلیں کھائیں۔ اگر آپ اپنا برانڈ بنائیں گے تو آپ ایک فرد سے ایک ادارہ بن سکتے ہیں۔ یہ ادارہ جس کا فیض آپ کی آنے والی نسلوں تک منتقل ہو۔ جس کا پھل قوم کھائے، جس کا پھل امت کھائے اور جس کا پھل صدیوں تک آنے والے انسان کھائیں۔ (زیر طبع کتاب ''سوچ کا ہمالیہ'' سے)

آپ کیوں زندہ ہیں

سارے کام ہی ٹھیک ہیں، مگر کاموں کے درمیان ایک ایسی نیت ہے جس سے سب چیزیں جڑتی ہیں۔ وہ نیت یہ ہے کہ میرے مالک جی رہا ہوں تو تیرے لیے جی رہا ہوں۔ دکان ہے تو تیرے لیے ہے، بچے ہیں تو تیرا حکم ہے تو پال رہا ہوں، پڑھ اس لیے رہا ہوں کہ تجھے علم والا مسلمان پسند ہے، کاروبار اس لیے چلا رہا ہوں کہ تو نے کہا ہے کہ اوپر والا ہاتھ نیچے والے ہاتھ سے بہتر ہے، جذبہ اس لیے ہے کہ تیری نظر میں سب سے پہلے وہ آتا ہے جوڑ پتا ہے، جو روتا ہے۔ اگر آپ کے ہر کام کے پیچھے نیت مالک ہے تو ہر کام کی سمت ایک ہوگی۔ پھر سونا بھی عبادت ہوگا، پہننا بھی عبادت ہوگا، چلنا بھی عبادت ہوگا، کھانا بھی عبادت ہوگا۔

مسئلہ یہ ہے کہ ہمیں پتا ہے کہ نوکری لگی ہوئی ہے، پیسے تو آنے ہی آنے ہیں۔ یقین کیجیے کہ جذبے سے کام کر کے دیکھیں، پیسہ پیچھے پیچھے آئے گا۔ آپ ڈبا نہ بنیں، انجن بنیں۔ ڈبے کی نشانی یہ ہے کہ وہ محتاج ہے۔ انجن محتاج نہیں ہوتا۔ قدرت نے انسان کو جو سب سے بڑی آگ دی ہے، آپ جذبے کو انجن بنائیں۔ شہرت کا ڈبا، عزت کا ڈبا، پیسے کا ڈبا، آسانیوں کا ڈبا، لوگوں سے میل جول کا ڈبا۔ یہ خود بہ خود آپ کے پیچھے چلتے آئیں گے۔

صرف ایک خوبی کو ہی اگر پکڑ لیا جائے تو وہ بہت بڑا نتیجہ دیتی ہے۔ مثال کے طور پر، اخلاق والے کی زندگی میں نہ مواقع کم ہوتے ہیں، نہ لوگ کم ہوتے ہیں۔ ہر فرد اس کیلئے خوش بختی بن جاتا ہے۔ ہر حادثہ اس کیلئے خوش قسمتی بن جاتا ہے۔ اگر آپ کے پاس اخلاق ہے تو پھر دنیا آپ کے سامنے سرنگوں ہوگی۔ اچھے خواب پالیں۔ جب دینا اللہ تعالیٰ نے ہے تو پھر مانگنے میں شرم کس بات کی۔ اگر رینگ رینگ کر ہی زندگی گزارنی ہے تو پھر زندگی کا کوئی مزہ نہیں ہے۔ ہم اپنی عقل و شعور کو اس قابل بنائیں کہ ہم ذمے داریاں اٹھا سکیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ بچے جن پر ذمہ داریاں پڑ جاتی ہیں، جلد سمجھ دار ہو جاتے ہیں، بہ نسبت ان کے جو بیٹھے رہتے ہیں، جو انتظار کرتے رہتے ہیں، جو گرم ہوا سے بچنا چاہتے ہیں۔

زندگی میں یہ ضرور کیجیے کہ اپنی زندگی کے مقصد کے متعلق لائن لگائیں۔ جو جو چیزیں اس سے جڑتی ہیں، وہ کرتے جائیں اور ان چیزوں کو چھوڑ دیں جو نہیں جڑتیں۔ اگر آپ نے یہ کام کر لیا تو آپ کے کام کی رفتار تیز ہو جائے گی۔ لوگوں کی رفتار اسی وجہ سے تیز نہیں ہوتی کہ انہیں پتا ہی نہیں ہے کہ کرنا کیا ہے اور کیا نہیں کرنا۔ ہم گھر سے بڑے کام کیلئے نکلتے ہیں اور محلے کی لڑائی دیکھ کر واپس آجاتے ہیں۔ ہمیں پتا ہی نہیں ہے کہ جو چیزیں ہم سے جڑی ہوئی ہیں، ان کا اس سے تعلق ہی کوئی نہیں ہے۔ کسی نے دانشور سے کہا، مجھے آپ سے بات کرنی ہے۔ اس نے کہا، ٹھہر جاؤ، پہلے مجھے ٹیسٹ کراؤ کہ میں یہ بات سنوں یا نہ سنوں۔ دانشور نے پوچھا، "بات مجھ سے متعلق ہے؟" اس نے جواب دیا، نہیں۔ دانشور نے پوچھا، "بات تجھ سے متعلق ہے؟" اس نے کہا، نہیں۔ دانشور نے کہا، "بات نہ تیرے فائدے کی ہے اور نہ میرے فائدے کی ہے، تو اس بات کا فائدہ کیا؟" ہم زندگی میں بے شمار چیزیں سن رہے ہیں، سمجھ رہے ہیں، پڑھ رہے ہیں، دیکھ رہے ہیں، وہ ہماری سمت سے نہیں ملتیں۔ اُن کاموں کو کرنے سے ہمیں کوئی فائدہ نہیں۔ جو آدمی یہ طے کر لیتا ہے کہ میں نے سننا کیا ہے، دیکھنا کیا ہے، اس کے پاس اس بات کی گرفت آجاتی ہے کہ میں نے سوچنا کیا ہے۔

زندگی میں اپنی سمت پر کام کیجیے۔ اگر سمت پر کام نہیں کریں گے تو پھر دن گزریں گے۔ یہ ہفتوں میں بدلیں گے، یہ مہینوں میں بدلیں گے، یہ برسوں میں بدلیں گے اور یہ برس زندگی میں بدلیں گے اور زندگی ختم ہو جائے گی۔ آپ کولھو کے بیل کی طرح کہیں نہیں پہنچیں گے، حالانکہ آپ ساری زندگی سفر کرتے رہے ہوں گے۔ (کتاب "بڑی منزل کا مسافر" سے)

خدارا، مخلص ہو جائیے

آج ہر شخص اپنی لاش کو کندھے پر لیے پھر رہا ہے۔ ہر شخص اپنے غم کا مداوا ڈھونڈ رہا ہے۔ ہر شخص چاہتا ہے کہ اسے سنا جائے۔ ہر شخص چاہتا ہے کہ اس کے غم غلط ہو جائیں۔ ہر شخص کے ہاتھ خود اپنا گریبان چاک کر رہے ہیں اور وہ منتظر ہے کہ کوئی ان ہاتھوں کو ہٹانے والا تو ہو۔ پڑھانے والے بہت ہیں، رٹا لگوانے والے بہت ہیں۔ جی پی اے دینے والی بہت ہیں۔ چرب زبانی کرنے والے بہت ہیں۔ سبز باغ دکھانے والے بہت ہیں۔

مگر۔۔۔

میں ڈھونڈتا ہوں کہ زندگی کہاں گئی؟ میں وہ کندھا تلاش کرتا ہوں جو مجھے اب کہیں نظر نہیں آتا۔

آج نوجوانوں کی فوج در فوج موجود ہے، لیکن سمت نہیں ہے۔ سکون کے ذرائع نہیں ہیں۔ ہر طرف فرسٹریشن ہے اور وہ اسے کہیں نہ کہیں نکال رہے ہیں۔ وہ بس اپنا وقت کاٹ کر کام چلا رہے ہیں۔ انھیں گالیاں سننا پڑتی ہیں، کیوں کہ وہ اگر کام بھی کرتے ہیں تو کسی کے کندھے پر سر رکھ کر، اپنا کندھا دینے کو تیار نہیں ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ بیزاری اور الجھن بڑھتی جا رہی ہے۔ ہر نوجوان زندگی سے عاجز ہے اور سسٹم کو کوس رہا ہے۔ اپنی غلطی تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہے۔

ہم گویا کہ ایک بھنور میں ہیں اور وہ بھنور ہمیں دھنساتا جا رہا ہے۔ ہم ڈوبتے جا رہے ہیں۔ ہمیں ادراک ہی نہیں کہ ہم کس قدر خطرات میں گھرتے جا رہے ہیں۔ اس کا حل کیا ہے؟

خدارا، اپنے ساتھ مخلص ہو جائیے۔ یہ زندگی جو بیس بائیس ہزار دنوں پر مشتمل ہے، ایک بار ملی ہے، اسے پورے خلوص اور محبت کے ساتھ گزاریے۔ خلوص اپنی ذات کے ساتھ، محبت اپنے آپ سے۔ جس دن آپ نے اپنے ساتھ خلوص اور محبت اختیار کر لی، اس دن آپ کو کندھا مل جائے گا۔ ایلس شفک اپنی کتاب ''محبت کے چالیس اصول'' میں کہتی ہے کہ محبت بھری ہوئی ہو تو کائنات میں محبت نظر آتی ہے۔ اپنے اندر محبت ہو تو کسی کو محبت دے سکتے ہیں۔ جو چیز اپنے اندر نہیں ہے، وہ دینا بہت مشکل ہے۔ اگر کسی کی شفقت ملے تو پھر کبھی نہ بھولیے کہ اب آپ کو بھی شفقت دینی ہے۔ اسی طرح زندگی کا پہیا گھومتا رہے گا اور محبت و شفقت پھیلتی رہے گی۔ یہ محبت و شفقت دوسروں کیلئے کندھا بنے گی۔ (زیرِ طبع کتاب ''سوچ کا ہمالیہ'' سے)